ربیع الاول، ربیع الثانی
علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ
نومبر 2020

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

Shangrila
THE FOOD EXPERTS!
IMLI GINGER SAUCE
BAR-B-Q SAUCE
GREEN CHILLI SAUCE
GARLIC CHILLI SAUCE
SHANGRILA KETCHUP AND SAUCES
TASTY!
DELICIOUS!
KHAANON KAY MUST HAVES!
Shangrila
TOMATO KETCHUP
Made with Real Tomatoes
SMART PACK
Tantalize your taste buds
TOMATO KETCHUP
600g
21.16 oz
www.shangrila.com.pk
shangrilaPakistan
ShangrilaPakistan

پیغامِ الٰہی جل جلالہ

عبدالعزیز

(مفہوم آیت: ۷۸ از سورۂ بقرہ)

''اور اُن میں ایسے لوگ ہیں جو اَن پڑھ ہیں، کتاب کا علم نہیں رکھتے سوائے آرزوؤں کے اور وہ لوگ صرف گمانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔''

عزیز دوستو! اس آیت میں یہودیوں کے جاہل، اَن پڑھ عوام کا تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ نہ توریت شریف پڑھ سکتے تھے، نہ اور کسی طرح کا علم رکھتے تھے، اس کے باوجود جھوٹی آرزوؤں میں الجھے رہتے تھے۔

یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ہم جنت میں ضرور جائیں گے۔ اگر عذاب ہوا بھی تو تھوڑے سے دن دوزخ میں رہیں گے، کیوں کہ ہم انبیائے کرام علیہم السلام کی نسل میں سے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقرب ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کی اولاد ہیں (نعوذ باللہ!) اور نبی صرف ہم ہی میں سے ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کی بہت سی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا تھے۔ بس خیالات کی دنیا میں پڑے رہتے تھے اور اپنی نجات اور اللہ تعالیٰ کے محبوب ہونے کے خیالی پلاؤ پکا رکھے تھے۔ ان کے خیال میں اللہ کے نبی حضرت محمد ﷺ کو جھٹلانے سے، اللہ کے ہاں ان کی عظمت میں کوئی فرق نہ آتا تھا، نہ سود کھانے سے ان کی دین داری میں کوئی فرق پڑتا تھا اور نہ کسی طرح کے کسی بھی بُرے عمل سے انھیں آخرت کی فکر لاحق ہوتی تھی۔ اپنے بارے میں جو جھوٹی آرزوئیں لیے بیٹھے تھے اور جو خوش کرنے والے گمانوں کی دنیا بسائے ہوئے تھے، بس اسی میں مست تھے۔

اس آیت کے مفہوم سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے:

☆ اپنی کتاب قرآن کریم اور اپنے دین کا علم حاصل کریں، کیوں کہ جاہل انسان کو سیدھی راہ سے ہٹانا شیطان کے لیے آسان ہوجاتا ہے۔ ☆ اپنے کسی بھی نیک عمل سے اپنے جنتی ہونے کو یقینی نہ سمجھیں، بل کہ نیک عمل کرنے کے باوجود اللہ سے ڈرتے رہیں اور سمجھیں کہ ہم اپنے عمل سے نہیں، بل کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی سے جنت میں جاسکیں گے۔ ☆ ہم چاہے کتنے ہی دین دار اور نیک گھرانے اور خاندان سے تعلق رکھتے ہوں، تب بھی خود سے نیک اعمال کرنے پڑیں گے، کیوں کہ باپ دادا کی دین داری کے باوجود ہم سے ہمارے اعمال کے بارے میں پوچھ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں مومنوں کی صفات اپنانے اور یہودیوں کی بُری صفات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین!

پیغامِ نبوی ﷺ

ارشد علی نواب شاہی

''حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تین انگلیوں سے کھاتے تھے اور جب کھانے سے فارغ ہو جاتے تو انگلیاں چاٹ لیتے تھے۔'' (مسلم: ۵۲۹۸)

عزیز ساتھیو! ہمارے پیارے نبی ﷺ زندگی گزارنے کے ہر ہر موقع کے آداب اور اخلاق سکھائے ہیں۔ آپ رحمۃ للعالمین ہیں۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے معلّم بنا کر ہمارے لیے بھیجا ہے۔ آپ ﷺ کے طریقے ہی کامیابی کے ضامن ہیں۔ جس کی زندگی جتنی حضور ﷺ کے طریقوں کے مطابق ہوگی، وہ اتنا ہی پُرسکون زندگی گزارے گا۔

آپ نے اوپر والی حدیث پڑھی۔ اس میں کھانے کے دو آداب کو بیان کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ تین انگلیوں سے کھاتے تھے۔ تین انگلیوں سے ہم سہولت سے کھا سکتے ہیں اور جب انگلیوں پر سالن یا کوئی کھانے کی چیز لگے تو پھر اس کو چاٹ لیں۔ لیکن......

اگر کوئی چیز تین انگلیوں سے کھانا مشکل ہو تو بقیہ دو انگلیاں بھی استعمال کی جا سکتی ہیں۔

اب بات کرتے ہیں انگلیاں چاٹنے کے بارے میں تو اس میں ایک بات کا ضرور خیال رکھیں کہ انگلیاں اس طرح چاٹیں کہ آواز نہ آئے، تاکہ ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کو ناگوار نہ گزرے۔

بعض بچے ان انگلیوں کو ٹشو یا کسی کپڑے سے صاف کر لیتے ہیں یا پھر دھو لیتے ہیں اور اس طرح انگلیوں پر لگا ہوا رزق ضائع ہو جاتا ہے، لیکن جب ہم انگلیاں سلیقے سے چاٹ لیں گے کہ تو رزق بھی ضائع نہیں ہوگا اور آپ ﷺ کی مبارک سنت پر عمل بھی ہو جائے گا، ان شاء اللہ!

عزیز ساتھیو! کھانے کے ان دو آداب، یعنی تین انگلیوں سے کھانے اور کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنے میں شرم نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ یہ ہمارے نبی ﷺ کی سنتیں ہیں اور ہمارے نبی ﷺ دنیا کے سب سے زیادہ مہذب انسان تھے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سنتوں پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

زیر سرپرستی:

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

ربیع الاول، ربیع الثانی ۱۴۴۲ ہجری | جلد: 15

شمارہ: 07

ناشر: محمد عارف رشید

مجلس ادارت

■ مدیر: عبدالعزیز

■ معاون: محمد طلحہ شاہین

مجلس مشاورت

پروفیسر محمد احمد خان صاحب

راشد علی نواب شاہی

سرورق السٹریٹر: سید ناصر

آرٹسٹ: قیصر شریف

کمپوزر: سعد علی

نگران ترسیل: منور عمر

اس رسالے کی تمام آمدنی تعلیم و تبلیغ اور اصلاح امت کے لیے وقف ہے۔

قیمت 70

سالانہ خریداری بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک 1000/=

بذریعہ عام ڈاک 750/=

ماہ نامہ ذوق و شوق میں اشتہار شائع کرنے کا مطلب تصدیق ہے نہ سفارش۔ یہ صرف عوام کو مطلع کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مصنوعات کے بارے میں قارئین خود تحقیق فرمالیں۔

خط و کتابت کا پتہ:

ماہ نامہ ذوق و شوق، پی۔او۔بکس نمبر 17984 پوسٹ کوڈ 75300 گلشن اقبال، کراچی

Email: zouqshouq@hotmail.com

zouq shouq/ذوق شوق

اشتہارات اور سالانہ خریداری کے لیے رابطہ کریں

0213-4990760, 0341-4410118

What's app: 0324-2028753

دفتری اوقات: صبح 8:00 تا 1:00 دوپہر 2:30 تا 6:00

رحمٰن کے بندے (حمد)
ارسلان اللہ خان | 8

اُف یہ عینک!
ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی | 17

اور طرح کی (نعت)
عائشہ صدیقہ عائش | 10

لاحاصل زندگی
غلام حسین میمن | 23

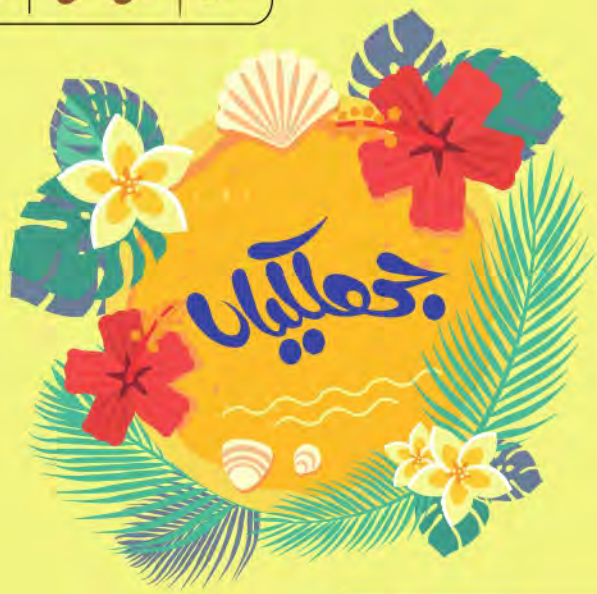

سیرت کہانی ۱۸
عبدالعزیز | 11

علامہ اقبالؒ (نظم)
ابن بشیر رحمانی | 24

خلائی دوست
محمد احمد رضا انصاری | 14

محافظ
محمد ندیم اختر | 25

پبلشر محمد عارف رشید نے بچوں کی تعلیمی و تربیتی ترقی و اصلاح کی خاطر ادارہ حسن پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

PARADISE BOOKS DISTRIBUTORS

Karachi: J-73, UNIT-1, GROUND FLOOR, OFF ALLAMA IQBAL ROAD, PECHS BLOCK-2, KARACHI. 021-34314981
LAHORE: SIDDIQUE MANAZIL, 2ND FLOOR, 40-ABBOT ROAD, STREET NEON PRINCE , LAHORE. 051-48430042
RAWALPINDI: OFFICE NO 2, FIRST FLOOR, STAR PLAZA, PARADISE HOUSE, RAWALPINDI. 042-3629701

گلی نمبر سات (پانی کہانی ۱۵)
نذیر انبالوی | 28

دور نہیں رہ سکتا
کاوش صدیقی | 42

اقبال کا شاہین
محمد نوید مرزا | 75

کاش.....! آپ جلدی آجاتے!
مفتی محمد معاویہ اسماعیل | 31

راجا صاحب
ضیاء اللہ محسن | 46

تین کا اچار (کھیل)
ادارہ | 79

...گویا
زاہدہ عروج تاج | 33

ابن غلام
عشرت زاہد | 52

معصب اور مدرسہ
انعم توصیف | 80

ٹکر مارے (بچو! اس کا نام بتانا ۵) (نظم)
ریحان طائر | 36

بلا عنوان (۱۵۹)
ام محمد احمد | 55

ابا کی سائیکل (نظم)
محمد رمضان شاکر | 83

فرق
بینا رانی | 37

ماہ نامہ ذوق وشوق (نظم)
محمد اسامہ سرسریؔ | 59

جاؤ کام کرو
الطاف حسین | 90

ایڈونچر
ش۔م۔دانش | 38

آسیب میرے گھر میں
بلال ہاشمی | 65

پانی (نظم)
روبینہ ممتاز روبی | 96

مانی اور شانی نے عیادت کی
آمنہ خورشید | 71

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Jamia-Uloom-Islamiyyah
(University of Islamic Sciences)
Allama Muhammad Yousuf Banuri Town
Karachi - Pakistan.

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
کراچی ۷۴۸۰۰ - پاکستان

Ref. No. _____ Date. _____

باسمہ تعالیٰ

از: حضرت مولانا داکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم
محترم اساتذہ کرام، ائمہ مساجد، ذمہ داران مدارس ومکاتب اور پرنسپل حضرات

طلبہ وطالبات کی تربیت کے لیے چند گزارشات

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت ہمارا اسلامی وقومی فریضہ ہے۔ بچے ملک وقوم کے معمار اور معاشرے کا حُسن ہوتے ہیں۔

اگر انھیں صحیح تعلیم وتربیت دی جائے تو اس سے ایک مضبوط اور مثالی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ کیوں کہ انھی بچوں میں سے پڑھ لکھ کر کوئی ڈاکٹر بنتا ہے، کوئی انجینیئر، کوئی عالمِ دین، کوئی افسر، کوئی تاجر، کوئی قانون دان، کوئی سیاست دان تو کوئی صحافی، الغرض زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہوکر وہ ملک وقوم کی خدمت میں حصہ لیتے ہیں۔

بچوں کی تعلیمی وتربیتی ترقی کے لیے آپ ۴ کام پابندی سے فرمائیں تو ایک کام یاب معاشرے کے وجود میں آپ کا ضرور حصہ ہوگا:

۱۔ آپ بچوں کے لیے خوب دعائیں مانگیں، ان پر خوب محنت کریں، ان کے بول چال پر نظر رکھیں۔ سچائی، امانت داری، ایثار، والدین کی اطاعت، بڑوں کا ادب، پڑوسیوں کا خیال، چھوٹوں پر شفقت اور ہر کام کو محنت ولگن سے صحیح طریقے سے کرنے کا بار بار درس دیں۔ یہ صفات بچوں کی زندگی میں آجائیں اس کے لیے "تربیتی نصاب" کے نام سے ایک نصاب تیار کیا گیا ہے۔

۲۔ بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انبیائے کرام علیہم السلام، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین وتبع تابعین رحمہم اللہ اور بزرگانِ دین کے حالات اور واقعات کو مختلف مثالوں اور کہانیوں کے ذریعے ان کے سامنے بیان کریں۔ ساتھ ہی عملی پہلوؤں کی الگ سے نشان دہی بھی کریں۔ اس کے علاوہ "صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات" اور "تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے واقعات" نامی کتابوں سے بچوں کو پڑھ کر سنائیں اور ان کو مطالعہ کرنے کی ترغیب دیں۔

۳۔ بچوں کو اردو زبان میں اچھے مواد پر مشتمل دینی رسائل وجرائد کے پڑھنے اور ان میں لکھنے کا عادی بنائیں۔ جس سے انھیں زبان وبیان کے ساتھ عمدہ تحریر پر قدرت حاصل ہوگی۔ پھر جب وہ عملی میدان میں جائیں گے تو آنی والی نسلوں کے سامنے اپنی بات اچھے انداز میں پیش کرسکیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

الحمد للہ! اسی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے "جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن"، "وفاق المدارس العربیہ پاکستان" کے فضلاء اور "اسکولوں کے اساتذہ کرام" کی زیرِ نگرانی بچوں کا ماہ نامہ "ذوق وشوق" شائع ہورہا ہے۔ ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ جس میں بچوں کو اساتذہ کرام اور والدین کے ادب، اسکول ومدرسے کی پابندی، پان گٹکا اور بری صحبت سے بچنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ میں اسے اللہ تعالیٰ کا خاص فضل سمجھتے ہوئے شکر بھی ادا کرتا ہوں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ

۴۔ اسکولوں میں بچوں کی تربیت کے لیے "پانچ منٹ کا مدرسہ" ایک کتاب تیار کی جارہی ہے۔ اگر اسمبلی میں روزانہ ۵ منٹ بچوں کو کتاب پڑھ کر سنا دی جائے تو بہت فائدہ ہوگا۔ ائمہ مساجد اور بنات کے مدارس کے مہتممین سے بھی یہی گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کو طالبات اور مقتدیوں کو بعد فجر یا عصر مناسب ہو تو سنائیں۔

آپ حضرات سے گزارش ہے کہ خود بھی اس کا مطالعہ کریں اور اپنے گھر، خاندان، اسکول، مکاتب اور مدارس کے بچوں کو اس کے پڑھنے کی خوب ترغیب دیں۔ تاکہ ہماری نسل کتاب دوست بنے۔ مساجد سے ملحق چھوٹی سی لائبریری بنائیں، نوجوانوں کو مطالعے کا شوق دلوائیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری اس گزارش پر عمل کرکے معاشرے کی اصلاح میں اپنا کردار ضرور ادا کریں گے۔

اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی قدم قدم پر مدد فرمائے اور آپ حضرات کو ہمیشہ سرسبز وشاداب رکھے۔ آمین

والسلام

عبدالرزاق اسکندر

۱۴۴۰/۱/۲

P.O. Box: 3465 Karachi Code No. 74800, Phone: (0092-21) - 34913570 - 34912683 - 34915966 - 34123366 - 34121152
Fax: (0092-21) - 34919531, Karachi Pakistan. URL: www.banuri.edu.pk , E-mail: info@banuri.edu.pk

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔

لیجیے جناب! پیشِ خدمت ہے اس سال، یعنی ۲۰۲۰ء کا ''سال نامہ''!

اسے ماہِ مئی ۲۰۲۰ء میں شائع کرنے کا ارادہ تھا۔ تمام تیاریاں ہو چکی تھیں، ادیبوں سے رابطے ہو چکے تھے، نئے انعامی سلسلوں کے حوالے سے سوچا جا چکا تھا۔ صفحات کی تعداد متعین کر لی گئی تھی۔ تزئین کار (ڈیزائنر) سے بات ہو چکی تھی کہ.....

وہی ہوا جس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔

اب الحمدللہ! حالات کافی حد تک بہتر ہیں۔ پہلے مدارس اور پھر اِسکول بھی کھل گئے ہیں۔ دیگر رسائل بھی کاغذ پر چھپنے لگے ہیں، لیکن چند مجبوریوں کی وجہ سے آپ کا اپنا ماہ نامہ ذوق وشوق اب تک کاغذ پر نہیں چھپ رہا، البتہ پی۔ڈی۔ایف کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ پی۔ڈی۔ایف ہی کی صورت میں سہی، شائع تو ہو رہا ہے نا! کاغذ پر نہ سہی، موبائل/ٹیبلٹ/لیپ ٹاپ/کمپیوٹر پر ہی سہی، پڑھنے کو مل تو رہا ہے نا!

اگر اِس طرح بھی نہ ہوتا، بل کہ بالکل ہی شائع نہ ہو پاتا تو ہم کیا کر لیتے! ہے نا سوچنے والی اور شکر کرنے والی بات!

پھر ''سال نامہ'' اگرچہ تاخیر سے شائع کیا جا رہا ہے، لیکن آپ پچھلے ماہ، یعنی اکتوبر میں ''خاص نمبر'' بنام ''یارانِ مصطفیٰ نمبر'' بھی پڑھ چکے ہیں اور اُس سے اگلے ہی ماہ، یعنی رواں ماہ (نومبر) میں ''سال نامہ'' پڑھیں گے۔

اسے کہتے ہیں: ''صبر کا پھل میٹھا!'' اب یہ کتنا میٹھا ہے؟ یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں، ہمیں تو بہت میٹھا لگ رہا ہے۔

ماہ نامہ ذوق وشوق کے ۲۰۲۰ء کے اس ''سال نامے'' میں ملیں گی آپ کو ڈھیر ساری کہانیاں، کئی ساری نظمیں، بہت سے انعامی سلسلے اور بہت کچھ۔

امید ہے آپ کو خوشی ہوگی۔ بس آپ کی یہی خوشی تو ہمیں مطلوب ہے۔ تو چلیے، پڑھنا شروع کیجیے۔

آپ سے ہمیں ایک شکایت ہے، وہ یہ کہ آپ ہمیں خطوط نہیں لکھ رہے۔ کیا کہا! کیسے لکھیں؟

ارے بھئی! ای۔میل کر دیجیے، واٹس اَپ کر دیجیے، آپ کا خط ہم تک پہنچ جائے گا۔

تو ہم آپ کے تبصروں بھرے خطوط کا انتظار کریں نا!

عبدالعزیز

خدا نے یہ بتلایا قرآن میں
ہیں کیا خوبیاں عبدِ رحمان میں
پڑھو تم بھی سورۂ فرقان میں
اضافہ کرو اپنے ایمان میں
ہمیشہ ہی چلتے ہیں دھیمی جو چال
کہ ہے عاجزی میں بھی ان کو کمال

رحمٰن کے بندے

ارسلان اللہ خان۔ حیدرآباد

کرے کوئی جاہل اگر قیل و قال
وہ اُن سے کرے کوئی بے جا سوال
اُلجھتے نہیں اُس سے کر کے کلام
وہ بڑھ جاتے ہیں آگے کر کے سلام
وہ کرتے ہیں اس بات کا التزام
کہ راتوں کو کرتے ہیں سجدہ ، قیام

یہی لب پہ اُن کے ہے دائم دعا
یہی التجا ہے ، یہی مُدعا
خدایا! جہنم سے ہم کو بچا
بُری ہے بہت یہ ٹھہرنے کی جا

وہ انصاف سے خرچ کرتے ہیں مال
کہ نہ پار ہو سرحدِ اعتدال
سمجھتے ہیں اسراف کو وہ زوال
ہیں گردانتے بخل کو وہ وبال

نہیں سر جھکاتے خدا کے سوا
کسی کو نہیں مارتے بےخطا

اگر بےحیائی کا ہو شائبہ
نہیں کام کرتے وہ ایسا ذرا
وہ جھوٹی گواہی بھی دیتے نہیں
غلط بات وہ منہ سے کہتے نہیں
بُری مجلسوں میں بھی رہتے نہیں
اثر لغو باتوں کا لیتے نہیں
سنائے کوئی رب کی آیات گر
تو بے شک وہ لیتے ہیں اس کا اثر
توجہ وہ دیتے ہیں قرآن پر
سمجھتے ہیں قرآن کو چارہ گر

وہ کرتے ہیں اللہ سے یہ دعا
مرے گھر کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنا

جنھیں تو نے تقویٰ کیا ہے عطا
بنا دے ہمیں اُن کا تو مقتدا
انھیں صبر کا یہ ملے گا صلہ
کہ جنت میں جائیں گے وہ جا بجا
ملے گی وہاں اُن کو اونچی جگہ
بہت خوب پائیں گے رب سے جزا
بہت کچھ ہے اُن کے لیے اہتمام
ملے گا اُنھیں صبر کا یہ انعام
کہ جنت میں ہے اُن کا دائم قیام
بہت ارسلاںؔ ہے وہ اچھا مقام

اور طرح کی

عائشہ صدیقی عائش۔نوشہرہ

ہر درد کی ملتی ہے دوا اور طرح کی ہے
دستِ محمد میں شِفا اور طرح کی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ہیں شہر حسیں اور بھی کُل ارض میں لوگو!
پر شہرِ مدینہ ہے جگہ اور طرح کی

سوچُوں جو کبھی گنبدِ خضریٰ کے مکیں کو (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)
ہوتی ہے مرے دل کی فضا اور طرح کی

جاں اپنی ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں ہر آن
عشاقِ نبی کی ہے وفا اور طرح کی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

کہہ دیں سرِ محشر مجھے سرکارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)
اک نعت سنا ہم کو ذرا اور طرح کی

جس دل میں بسی صرف محمد کی ادائیں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)
اُس دل کو ملی تابِ ضیا اور طرح کی

اُس در پہ کبھی رب سے دعا مانگ کے دیکھو
ملتی ہے مدینے میں جزا اور طرح کی

پُر نور ہے گر صبح حرم پاک کی عائشؔ!
طیبہ میں ہے پُرکیف مسا اور طرح کی

سیرت مصطفیٰ ۱۸

عبدالعزیز

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی اور سیرت کے اہم واقعات پر مبنی ایک پیارا سلسلہ۔

اسی عرصے میں حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ مکہ آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کے کام میں مصروف تھے۔ حضرت طفیل رضی اللہ عنہ اچھے خاندان کے آدمی تھے۔ بڑے شاعر، بہت سمجھ دار اور مہمان نواز آدمی تھے۔ مکے میں قریش کے کچھ لوگوں نے ان سے کہا:

”ہم میں ایک ایسا شخص ہے جس نے پوری قوم میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ اس کی بات چیت میں جادو کا سا اثر ہے، جسے سن کر باپ بیٹے، بھائی بھائی اور میاں بیوی کے درمیان لڑائی ہو جاتی ہے۔ آپ اس شخص سے بچ کر رہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ آپ اور آپ کی قوم بھی کہیں اس مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے، جہاں تک ممکن ہو آپ اس کی کوئی بات نہ سنیں۔“

قریش کے لوگوں نے اس طرح کی باتیں کر کے انھیں اتنا ڈرایا کہ انھوں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی کہ اتفاقیہ طور پر بھی اس شخص کا کلام کان میں نہ پڑ جائے، یہاں تک کہ لوگ انھیں ”دو روئی والا“ کہنے لگے۔

حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”ایک روز میں مسجد حرام کی طرف گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے سامنے کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں آپ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا، حالاں کہ میں یہ چاہتا تھا کہ آپ کا کلام نہ سنوں، مگر اللہ تعالیٰ یہ چاہتے تھے کہ میں آپ کا کلام سنوں، لہٰذا بے اختیار میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سن لیا، جو مجھے بہت اچھا لگا۔ اس وقت میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں سمجھ دار آدمی ہوں اور شاعر بھی ہوں، پھر مجھے کسی کے کلام کا اچھا اور بُرا ہونا بھی معلوم ہو جاتا ہے، لہٰذا میں ان کا کلام سن لیتا ہوں، اگر اچھا لگا تو قبول کر لوں گا اور اگر بُرا لگا تو چھوڑ دوں گا۔

چناں چہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ سے واپس نکلے تو میں آپ کے پیچھے ہولیا۔ جب آپ اپنے گھر پہنچے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کی قوم نے مجھے آپ کا کلام سننے سے اتنا ڈرایا تھا کہ میں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی، تاکہ آپ کا کلام نہ سن پاؤں، مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میں آپ کا کلام سننے پر مجبور ہو گیا جو مجھے بہت اچھا لگا۔ آپ مجھے اپنے دین کے بارے میں بتلائیے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور قرآن کریم کی تلاوت فرمائی۔ (ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری تین سورتوں کی تلاوت فرمائی۔) خدا کی قسم! میں نے قرآن کریم سے بہتر کبھی کوئی کلام سنا ہی نہیں اور اِسلام سے زیادہ معتدل کسی دین کو نہیں پایا۔ میں اسی وقت مسلمان ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

’اے اللہ کے نبی! میں اپنی قوم کا سردار ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد اپنی قوم کو اِسلام کی دعوت دوں۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کر دیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کوئی نشانی عطا فرمائے کہ جو اِس بارے میں میری مددگار ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی:

’اے اللہ! اس کے لیے کوئی نشانی پیدا فرما دے۔‘

چناں چہ جب میں اپنی بستی کے قریب پہنچا تو میری آنکھوں کے درمیان چراغ کی طرح کی ایک روشنی پیدا ہو گئی۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! اس روشنی کو بجائے چہرے کے کسی اور جگہ منتقل فرما دے، کہیں میری قوم اسے عیب نہ سمجھے

اور

یہ خیال نہ کرے کہ

اپنے باپ دادا کا مذہب چھوڑنے

کی وجہ سے اس کی صورت بدل گئی۔

دعا کرتے ہی وہ روشنی میرے چہرے سے ختم ہوگئی اور میرے کوڑے میں ظاہر ہوگئی اور وہ کوڑا ایک لالٹین کی طرح سے بن گیا۔

(ایک روایت میں ہے کہ اس وقت رات ہو رہی تھی، بارش برس رہی تھی اور راستہ نظر نہیں آ رہا تھا تو اُنھوں نے دعا کی جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ روشنی پیدا فرما دی۔ لوگ یہ منظر دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور اُس کوڑے کو چھونے لگے تو روشنی ان کے ہاتھوں سے چھننے لگی۔ یہی نہیں، بل کہ آئندہ بھی جب رات اندھیری ہوتی، وہ کوڑا اسی طرح روشن ہو جاتا۔ اسی وجہ سے حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ ''نور والے'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔)

جب صبح ہوئی تو میں نے اپنے والد صاحب کو اِسلام کی دعوت دی اور پھر بیوی کو۔ دونوں نے کپڑے پاک کیے اور اِسلام قبول کر لیا اور بیوی سے میں نے یہ کہا کہ اگر تجھے یہ ڈر ہے کہ بتوں کو چھوڑنے کی وجہ سے کہیں بچوں کو کوئی نقصان نہ ہو تو میں اس کا ذمے دار ہوں۔

اس کے بعد اپنے قبیلے دوس کو میں نے اسلام کی طرف بلایا، مگر اُنھوں نے اسلام قبول کرنے میں دیر کی تو میں مکہ مکرمہ دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے عرض کیا:

'اے اللہ کے نبی! میرے قبیلے دوس نے اسلام کی دعوت قبول نہیں کی، آپ ان کے بارے میں بددعا کر دیجیے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر یہ دعا فرمائی:

'اے اللہ! دوس قبیلے کو ہدایت دے اور مسلمان بنا کر یہاں بھیج دے۔' اور فرمایا:

'جاؤ، نرمی سے اسلام کی طرف بلاؤ۔'

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے مطابق میں لوگوں کو اِسلام کی طرف بلاتا رہا۔ سات ہجری تک ستر یا اسّی گھرانے اسلام لے آئے اور میں ان سب کو لے کر سات ہجری میں مدینہ منورہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

فتح مکہ کے بعد میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ عمرو بن حمیمہ کے بت 'ذوالکفین' کو جلانے کی مجھے اجازت دے دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت دے دی۔''

حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر اُس بت کو جلا دیا۔ وہ بت جلاتے جاتے تھے اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

''اے ذوالکفین! میں تیری عبادت کرنے والوں میں سے نہیں ہوں، میری پیدائش تیری پیدائش سے پہلے کی ہے۔''

ان کا قبیلہ دوس تقریباً آدھا تو پہلے ہی اسلام لے آیا تھا، باقی آدھا اس بت کو جلانے سے اسلام لے آیا۔

اسی طرح ایک اور صحابی ہیں جن کا نام ضماد اَزدی رضی اللہ عنہ ہے۔ یہ یمن کے باشندے اور قبیلہ ازد شنوءہ کے فرد تھے۔ جھاڑ پھونک کرنا اور آسیب اتارنا ان کا کام تھا۔ مکہ آئے تو وہاں کے لوگوں سے سنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پاگل ہیں۔ (نعوذ باللہ!)

انھوں نے سوچا کہ کیوں نا اس شخص کے پاس جاؤں، ہوسکتا ہے خدا میرے ہی ہاتھوں سے اسے شفا دے دے، چناں چہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور کہا:

''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں آسیب اتارنے کے لیے جھاڑ پھونک کیا کرتا ہوں۔ کیا آپ کو بھی اس کی ضرورت ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

''یقیناً ساری تعریف اللہ کے لیے ہے، ہم اسی کی تعریف کرتے ہیں اور اُسی سے مدد چاہتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گم راہ نہیں کر سکتا اور جسے اللہ گم راہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور میں اس کا بندہ اور رسول ہوں۔''

ضماد نے کہا:

''آپ یہ کلمات مجھے دوبارہ سنا دیجیے۔''

آپ ﷺ نے تین بار دُہرائے۔ اس کے بعد ضماد نے کہا:

میں کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں کی بات سن چکا ہوں، لیکن میں نے آپ کے جیسے کلمات کہیں نہیں سنے، یہ تو سمندر کی گہرائی کو پہنچے ہوئے ہیں۔''

اس کے بعد اُنھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

حضور ﷺ اسلام کی دعوت دیتے رہے اور لوگ حضور علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہہ کر مسلمان ہوتے رہے۔ قریش کے لوگوں نے بھی آپ ﷺ کو اِسلام کی دعوت سے روکنے کے لیے اپنے حربے جاری رکھے ہوئے تھے، چناں چہ حضور ﷺ رات کے اندھیرے میں قبیلوں کے پاس تشریف لے جاتے، تاکہ مکے کا کوئی مشرک رکاوٹ نہ ڈال سکے۔

ایک رات آپ ﷺ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر باہر نکلے۔ بنو ذہل اور بنو شیبان کے ڈیروں سے گزرے تو اُنھیں اسلام کی دعوت دی۔ ان لوگوں نے بات تو سنی، لیکن اسلام قبول نہیں کیا، پھر آپ ﷺ منیٰ کی گھاٹی سے گزرے تو کچھ لوگوں کو آپس میں گفتگو کرتے ہوئے سنا۔ آپ ﷺ سیدھے ان کے پاس جا پہنچے۔ یہ یثرب، یعنی مدینے کے چھے نوجوان تھے اور سب کے سب قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں:

اسعد بن زرارہ۔ عوف بن حارث۔ رافع بن مالک۔ قطبہ بن عامر۔ عقبہ بن عامر۔ حارث بن عبداللہ۔

مدینے والوں نے یہودیوں سے یہ سن رکھا تھا کہ اس زمانے میں ایک نبی بھیجا جانے والا ہے اور اَب جلد ہی وہ ظاہر ہوگا۔ ہم اس کی پیروی کر کے اس کے ساتھ ہو جائیں گے اور تمھیں پچھلی قوموں کی طرح قتل کر ڈالیں گے۔ یہودیوں کی ان باتوں کا مدینے کے ان نوجوانوں کو بڑا فائدہ ہوا، وہ اس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے پاس پہنچ کر پوچھا: ''تم کون لوگ ہو؟''

انھوں نے کہا:

''قبیلہ خزرج کے لوگ ہیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''یعنی یہود کے ساتھی؟''

بولے:

''ہاں۔''

فرمایا:

''پھر کیوں نا بیٹھ کر کچھ بات چیت کرلیں۔''

وہ لوگ بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام کی حقیقت بیان فرمائی۔ انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور قرآن کریم کی تلاوت فرمائی۔ ان لوگوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا:

''بھائی دیکھو، یہ تو وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کا حوالہ دے کر یہود ہمیں دھمکیاں دیا کرتے ہیں، لہٰذا یہودی ہم پر سبقت نہ لے جانے پائیں۔''

اس کے بعد ان چھے کے چھے نوجوانوں نے فوراً آپ ﷺ کی دعوت قبول کرلی اور مسلمان ہوگئے۔

ان لوگوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا:

''ہم اپنی قوم کو اِس حالت میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ کسی اور قوم میں ان جیسی دشمنی نہیں پائی جاتی۔ امید ہے کہ اللہ آپ کے ذریعے انھیں ایک کر دے۔ ہم وہاں جا کر لوگوں کو آپ کے مقصد کی طرف بلائیں گے اور وہ دین جو ہم نے خود قبول کرلیا ہے، ان کے سامنے بھی پیش کریں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ پر اُنھیں جمع کر دیا تو پھر آپ سے بڑھ کر کوئی اور عزت والا نہ ہوگا۔''

اس کے بعد وہ لوگ مدینہ واپس ہوئے تو اپنے ساتھ اسلام کا پیغام بھی لے گئے، چناں چہ ہر گھر میں رسول اللہ ﷺ کا چرچا ہوگیا۔

.....(جاری ہے).....

خلائی دوست

محمد احمد رضا انصاری۔ کوٹ ادّو

معاذ اور اَبان اپنے چھوٹے سے خلائی جہاز میں بیٹھے اس وقت خلا (اسپیس) کی سیر کر رہے تھے۔

آج اتوار تھا۔ چھٹی کے دن معاذ نے خلا کی سیر کا پروگرام بنایا۔ اس نے اپنے دوست اور ہمسائے ابان کو بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی، جسے ابان نے بخوشی قبول کر لیا۔ دونوں بچوں نے اپنے گھر والوں سے اسپیس میں جانے کی اجازت طلب کی۔ ابان کے والدین نے بہت خوشی سے اجازت دے دی۔ معاذ اپنے گھر آیا اور اپنی والدہ کو سیر پر جانے کا بتایا۔ والدہ کچھ پریشان سی ہوگئیں۔ انھیں سوچ میں ڈوبا دیکھ کر معاذ فکرمندی سے بولا:

''امی! کیا بات ہے؟ آپ پہلے تو کبھی اجازت دیتے ہوئے نہیں ہچکچائیں؟''

3020 کا سال ہے۔ اس دور میں خلا میں جانا ایسا ہی ہے جیسے ایک شہر سے دوسرے شہر جانا۔ جدید اور اِنتہائی تیز رفتار اسپیس شپس میں گھنٹوں کا فاصلہ محض چند منٹوں میں طے ہوجاتا ہے۔ تقریباً ہر گھر میں ایک چھوٹا خلائی جہاز لازمی موجود ہے۔ لوگ روز اپنے کام کاج اور دیگر معاملات نمٹانے دوسرے سیاروں پر جاتے رہتے ہیں۔

''اچھا، چلے جاؤ، لیکن خلا میں زیادہ دور نہ جانا۔ میں نے ابھی ایک خبر سُنی کہ کسی خلائی مخلوق کا جہاز زمین کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مجھے تم دونوں کی فکر رہے گی، لہٰذا جلدی لوٹ آنا۔'' بالآخر سوچ بچار کے بعد والدہ نے انھیں اجازت دے دی۔ خلائی مخلوق کا سُن کر دونوں چونک اٹھے۔

''امی! وہ کوئی انسان ہی ہوگا۔ ہمارے اس نظامِ شمسی کے کسی بھی سیارے پر کوئی دوسری مخلوق نہیں ہے۔ تین سو سال سے ہمارے سائنس دان ان سیاروں پر کسی زندہ مخلوق کا کوئی سراغ نہیں لگا پائے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔'' معاذ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

والدہ کو اَلوداعی کلمات کہہ کر وہ اپنے گھر میں کھڑے اسپیس شپ میں بیٹھ کر خلا میں آ گئے۔

''تم کیا کہتے ہو ابان! کیا واقعی اس خلائی جہاز میں کوئی دوسری دنیا کی مخلوق ہوگی؟'' معاذ اپنے جہاز کو مستعدی سے کنٹرول میں رکھتے ہوئے ابان کی طرف نظریں گھما کر بولا۔

''سچ کہوں تو مجھے یہی لگتا ہے۔ سوچو، پچھلے تین ماہ سے مسلسل اسی قسم کی افواہیں زمین پر گردش کر رہی ہیں۔ مجھے بھی اب ان پر کچھ تھوڑا سا یقین ہو چلا ہے۔'' ابان نے دور سرخ سیارے (مریخ) کی سمت دیکھتے ہوئے ہولے سے جواب دیا۔

''خلائی مخلوق بھلا کیسی شکل و صورت کی ہوگی؟'' یہ سوال ابان نے اٹھایا۔

''شاید بہت بڑے سر، تکونے منہ اور چھوٹے جسم والی یا پھر بلبلے نما تین آنکھوں والی نیلی مخلوق!'' معاذ نے اندازہ لگایا۔

''کاش! کوئی خلائی مخلوق ہم حقیقت میں بھی دیکھ سکیں۔ سچ میں آنکھیں ترس گئی ہیں ہماری۔'' ابان نے شرارت سے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کی حرکت پر معاذ نے مصنوعی غصے اور تیکھی نظروں سے اسے گھورا، پھر دونوں ہنس پڑے۔

کچھ دیر خلا میں گھوم کر معاذ نے ابان سے پوچھا:

''اب کہاں چلنا ہے؟''

''مجھے اپنے ہوم ورک کے لیے چاند کے پچھلے حصے کی چند تصاویر چاہییں، چاند کے قریب چلو۔'' ابان نے کہا۔

معاذ نے اثبات میں سر ہلایا اور اِسپیس شپ کا رُخ تبدیل کر دیا۔ وہ بہت تیزی سے چاند کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آج راستوں میں اسپیس شپ نہ ہونے کے برابر تھے، صرف چند اسپیس شپ ہی انھیں نظر آ رہے تھے۔ شاید لوگ خلائی مخلوق کے جہاز کا سُن کر خلا میں آنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔

معاذ نے جہاز کو آٹو پائلٹ پر کر دیا۔ اب اسے کنٹرول کرنے کی ضرورت نہ تھی، وہ خود بخود چل رہا تھا۔ معاذ نے اپنے پینل پر پھیلے بے شمار بٹنوں میں سے چند کو پریس کیا۔ معاذ اور اَبان کے درمیان ایک ٹرے نکل آئی، جس میں کھانا رکھا ہوا تھا۔ دونوں دوست باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کھانے سے بھی لطف اندوز ہونے لگے۔ کھانا کھا کر معاذ اپنی نشست پر قیلولہ کرنے لیٹ گیا، جب کہ ابان جہاز کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ کہکشاں میں ستارے اور سیارے، ہیروں کی مانند چمک رہے تھے۔ اسے یہ منظر بہت اچھا لگا۔

اچانک ابان کی نظر سامنے کچھ دور ایک چیز پر گئی۔ وہ دُور ایک دھبے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ حرکت کرتا وہ دھبا بالکل ان کے سامنے تھا اور اِسی سمت تیز رفتاری سے آ رہا تھا۔ دور ہونے کی وجہ سے ابان صحیح طرح اس بات کا اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کیا شے ہے۔

اس نے پینل پر چند بٹن دبائے اور ایک لیور کو اوپر کی طرف کیا۔ ایک اسکرین روشن ہوئی اور اُس پر وہ شے واضح طور پر نظر آنے لگی۔ اسے دیکھتے ہی ابان خوف سے اچھل پڑا۔ وہ بلبلہ نما ایک خلائی جہاز تھا۔ ایسی ساخت کے جہاز زمین پر کہیں نہیں تھے۔

''کیا یہ اسی خلائی مخلوق کا اسپیس شپ ہے؟'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

پھر اَبان نے فوراً معاذ کو جھنجوڑ کر اُٹھایا۔

''معاذ! معاذ! جلدی اٹھو۔''

معاذ آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ہلکورے لے رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟''

''یہ دیکھو۔'' ابان نے روشن اسکرین پر نظر آتے خلائی جہاز کی طرف اشارہ کیا۔

بلبلہ نما جہاز دیکھ کر معاذ بھی چونک گیا۔

''خلائی مخلوق!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کیا واقعی یہ خلائی مخلوق کا جہاز ہے!؟''

''ہاں، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔ یہ وہی ہے جس کا دنیا پر کئی دنوں سے چرچا ہو رہا ہے۔'' معاذ نے جواب دیا اور اُس نے اپنے اسپیس شپ کو آٹو پائلٹ سے ہٹا کر اپنے کنٹرول میں لے لیا۔

محض چند منٹوں بعد وہ اس جہاز کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اچانک اسپیس شپ میں لگے کمپیوٹر پر ایک پیغام موصول ہوا۔ وہ میسج بلبلہ نما اسپیس شپ سے بھیجا گیا تھا۔ معاذ کے جدید اور فاسٹ کمپیوٹر نے لمحوں میں اس میسج کو اُن کی زبان میں ڈی۔کوڈ کر دیا۔

ابان اور معاذ اُس میسج کو پڑھنے لگے۔ میسج بہت مختصر سا تھا۔ لکھا تھا: ''ہیلپ می''۔ ساتھ ایک ایک بچے کی تصویر تھی جو اِنسانوں سے ملتا جلتا تھا۔ اس کا رنگ سبز اور قد عام بچوں سے کچھ کم تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں جو گہرے سبز رنگ ہی کی تھیں۔

''کیا اسے مدد کی ضرورت ہے؟'' ابان ڈرے ڈرے لہجے میں بولا۔ یوں اجنبی مخلوق کے اتنے قریب آنے پر اُن کا ڈرنا فطری عمل تھا۔

بلبلہ نما جہاز رُک چکا تھا۔ معاذ اپنا اسپیس شپ اس کے قریب لے آیا۔

جہاز کے شفاف شیشوں سے اندر کنٹرول روم میں وہی بچہ بیٹھا خوف زدہ نظروں سے ان کے اسپیس شپ کو دیکھ رہا تھا۔

معاذ نے اسے جوابی پیغام بھیجا:

''تم کون ہو اور کس سیارے سے آئے ہو۔ ہم تمھاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

خلائی بچہ اپنے پینل پر بٹن پریس کرنے لگا۔ کچھ لمحے بعد اُس کا میسج معاذ کے سامنے اسکرین پر موجود تھا۔

میرا نام زینگ ہے۔ میں ماریش نامی سیارے کا باشندہ ہوں۔ کچھ ہفتوں پہلے ایک بہت بڑا شہاب ثاقب ہمارے سیارے سے ٹکرا گیا تھا۔ میں اس دن بیج اکٹھے کرنے قریبی سیارے پر گیا ہوا تھا۔ اس ہولناک سانحے میں سب لوگ مارے گئے، صرف میں ہی بچ پایا۔ پلیز، میری مدد کرو۔

میں پچھلے تین ہفتوں سے خلا میں بھٹک رہا ہوں۔ میرے جہاز میں خوراک کا ذخیرہ بھی ختم ہوگیا ہے۔ مجھے اپنے سیارے پر لے چلو۔''

معاذ نے زینگ کو تسلی دی اور کہا:

''میرے جہاز کے پیچھے پیچھے آؤ۔'' یہ کہہ کر اُس نے اسپیس شپ کا رُخ دوبارہ زمین کی طرف موڑ دیا۔ دونوں جہاز آگے پیچھے زمین کے قریب ہونے لگے۔

معاذ نے زمین پر خلائی بچے کے بارے میں پیغام بھیج دیا۔ خلائی مخلوق کا سُن کر زمین پر تھرتھری سی مچ گئی۔ سب لوگ اپنے اپنے کمپیوٹر، ٹیبز اور موبائل کھول کر خلائی مخلوق کو دیکھنے کے لیے تیار ہوگئے۔

سائنس دانوں اور میڈیا والوں کی ایک کثیر تعداد معاذ کے گھر کے سامنے پہنچ گئی۔

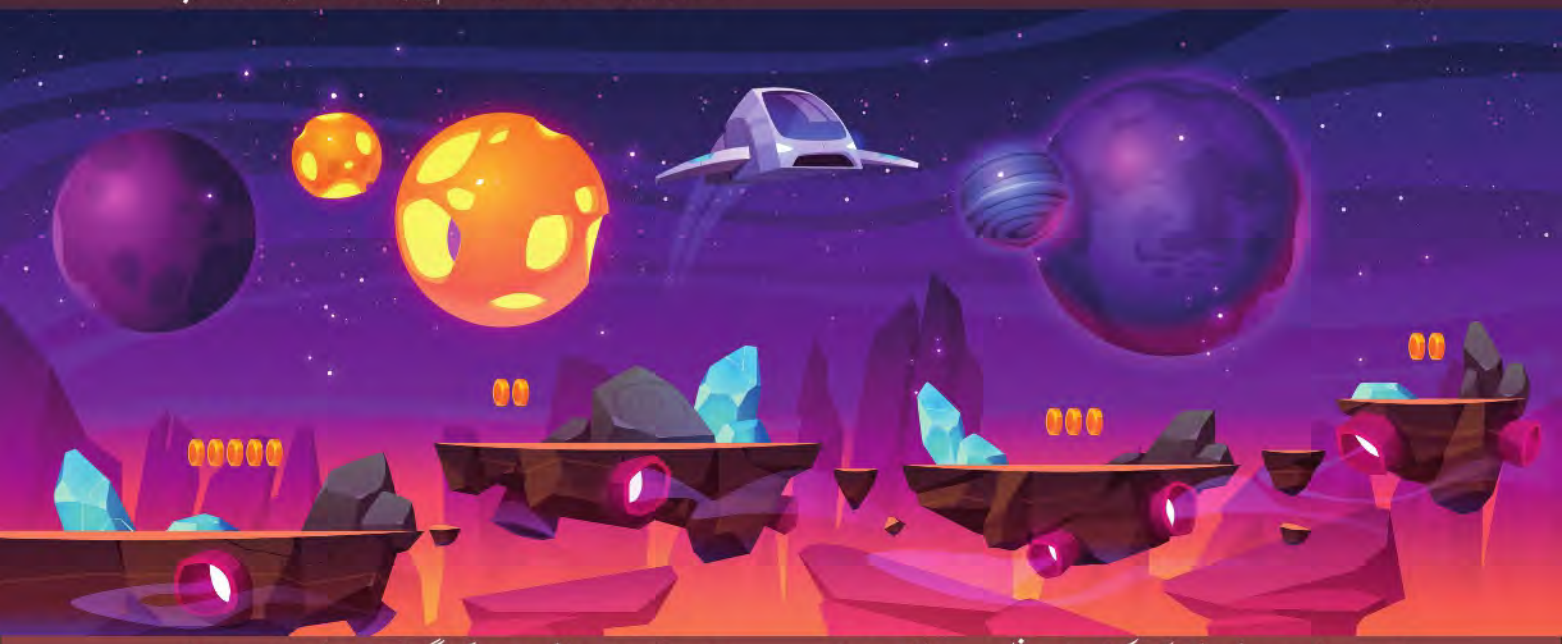

جیسے ہی دونوں جہاز اُن کے ملک کی فضا میں داخل ہوئے، آرمی والے اسپیس شپس نے انھیں اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا۔ زمین پر لینڈنگ کر کے وہ تینوں اپنے اپنے اسپیس شپ سے باہر نکلے تو لوگوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پولیس والوں نے انھیں اپنے گھیرے میں لیا اور زینگ کو ایک وین میں پہنچا دیا۔ وین ایک کثیر المنزلہ بلڈنگ کے سامنے جا رُکی۔ ملک کے مشہور سائنس دان اسے سرکاری تجربہ گاہ لے آئے۔ ایک ہفتے تک وہ اس کا معاینہ کرتے رہے کہ وہ زمینی ماحول میں رہ سکتا ہے یا اُس کی وجہ سے زمین کو کسی نقصان کا کوئی خدشہ تو نہیں۔ تمام ٹیسٹ میں وہ کلیئر نکلا۔ اس دوران میں ابان اور معاذ روز اُسے ملنے آتے رہے۔ ایک ہفتے میں ہی تینوں بچے ایک دوسرے کی زبان کچھ کچھ بولنے اور سمجھنے لگ گئے۔

آخر ایک ہفتے کی تحقیق کے بعد زینگ کو زمین پر رہنے کی اجازت مل گئی۔ اب وہ آزادنہ طور پر زمین پر رہ سکتا تھا۔

معاذ نے زینگ کو اپنے گھر میں رہنے کا کہا۔ زینگ اس کی دعوت رد نہ کر سکا اور خوشی سے مان گیا۔ معاذ ایک اُلجھن کا شکار تھا کہ زینگ انسانوں سے اتنا ملتا جلتا کیوں ہے؟

ایک رات زینگ نے اسے اپنی کہانی سنائی کہ اس کے آباؤ اجداد زمین کے رہنے والے ہی تھے۔ یہ ہزاروں سال پہلے کا ذکر ہے۔ اس وقت ان لوگوں نے اتنی ترقی کی تھی کہ اس دور میں انھوں نے ایٹم بم بنا لیا تھا۔ میرے خاندان کے ایک بزرگ ایٹم بم کے خلاف تھے۔ انھوں نے دوسروں کو اُس سے باز رکھنے کی اپنی سی کوشش کی، لیکن وہ کام یاب نہ ہوئے۔ ایک دن وہ اپنے خاندان کے ساتھ ماریش پر ہجرت کر گئے، جس کا ماحول زمین جیسا ہی تھا۔

اور کچھ سالوں بعد زمین پر ہول ناک دھماکا ہوا۔ ایٹم بم بلاسٹ ہوگیا۔ زمین پر موجود لاکھوں انسان لمحوں میں پانی بن گئے۔''

معاذ کے لیے یہ کہانی نہایت حیرت انگیز تھی۔ اس نے شکر کا کلمہ پڑھا کہ اس دور کے انسانوں نے عقل مندی دکھائی ہے اور اَب ایٹم بمز نہیں بنائے ہیں۔ زمین اب اس خطرے سے باہر ہے۔

اُف یہ عینک!

ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی۔ کراچی

ہمارا تعارف کسی کتابی کیڑے کے طور پر خاندان بھر میں عام ہے، ہمارے کتابی چہرے کی وجہ سے، حالاں کہ کتابی کی حد تک تو یہ بات کسی نہ کسی طرح درست ہو بھی سکتی ہے، مگر کیڑا ہمیں نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ ایک تو ہم لڑکی ہیں، دوسری بات یہ کہ عظیم الجثہ، یعنی بھاری بھرکم ہیں، بل کہ ہماری اسکول کی سہیلیاں تو کہا کرتی ہیں کہ بیٹھے بیٹھے پڑھ لکھ کر ہم ٹینک بن جائیں گے۔ (وہ والا ٹینک جو گولا باری کرتا ہے۔)

اب خیر، ہم اتنے عظیم نہیں جتنا کہ ٹینک ہوتا ہے، مگر خوش باش اور خوش خوراک ہونے کی وجہ سے ذرا سے مناسب ضرور ہیں، اپنی دونوں سہیلیوں کی طرح ''سرکنڈے'' نہیں لگتے، تاہم پڑھنے لکھنے اور بچوں کے رسائل اور اِشتیاق احمدؒ کے ناول چاٹنے کی پرانی بیماری ہے، پھر چوں کہ پڑھائی کے بعد وقت کم بچتا ہے، اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ مغرب کے بعد قرآن پاک کی تلاوت، ترجمہ اور مطالعہ حدیث اور پھر عشائیہ اور عشا کی نماز کے بعد اِشتیاق احمدؒ کا ایک ناول پڑھ کر سونے سے پہلے خوب مزے کریں گے۔ مونگ پھلی کھانے کا مزہ بھی جبھی ہے کہ کتاب بھی ہو، لیکن وائے قسمت کہ ابھی دوسرے دن کے دوسرے ناول کا دوسرا صفحہ ہی پڑھا تھا کہ ابا حضور نے ہمیں پکڑ لیا۔ اگرچہ ابا حضور کا محکمہ پولیس سے دور پار کا بھی واسطہ نہیں ہے، مگر صرف چلنے پھرنے یا بیٹھنے کے انداز سے بھی نجانے انھیں کیسے یہ پتا لگ جاتا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کیا کرنے والے ہیں؟ کسی شرارت میں مصروف ہیں یا کسی کام میں؟

ہم نے رات کے اس مطالعے کو یقینی بنانے کی ہر ممکن تدبیر کر ڈالی تھی۔ چھوٹی سی ایک ٹارچ کا انتظام موٹے لحاف کے اندر کیا۔ سخت سردی میں یوں بھی ہم لحاف میں ''غروب'' ہو کر گھر بھر کو اپنے ''اُجالے'' سے محروم کر دیتے ہیں، لیکن لحاف کے اندر ہمارے وجود کی روشنی کے علاوہ ایک ہلکی سی روشنی دیتے ٹارچ کی موجودگی ہماری پڑھائی کو ممکن اور یقینی بنانے کا اچھا طریقہ ثابت ہوگئی۔ بس خطرہ صرف یہ تھا کہ کہیں ہم پکڑے نہ جائیں اور دوسرے ہی دن یہ ناگوار واقعہ پیش آ گیا!

''روشنی؟ روشنی بیٹی! یہ تم ہل ہل کر سو رہی ہو آج؟'' ابا حضور نے کمرے کے دروازے ہی سے ہمیں، یعنی ہمارے لحاف کو ہلتے جلتے دیکھ کر ہمیں پکڑ لیا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ کہانی میں ''سچویشن'' خاصی سنسنی خیز ہوگئی تھی۔ اگر ہم لحاف کی جگہ کرسی یا سوفے پر بیٹھے اس طرح کی سنسنی خیز چیز پڑھ رہے ہوتے ہیں تو اُس کے ہتھے پہ چڑھ کر ایک چیخ مار دیتے ہیں اور بھیا جل کر کہتے ہیں: اگلی سچویشن پر شاید تم کھڑکی پر چڑھ جاؤ گی اور اُس سے اگلی پر شاید چھت پر؟ ہاہاہا!

مگر ہم اتنے منہمک ہو کر، بل کہ ڈوب کر پڑھنے کے عادی ہیں کہ سامنے موجود بھیا یا چھوٹی بہن سوہنی ہمیں بالکل دھندلے نظر آتے ہیں، تاہم سوہنی کا خیال یہ ہے کہ دھندلا نظر آنے کا تعلق ڈوب کر پڑھنے سے نہیں ہے، بل کہ نظر کمزور ہو جانے کا سگنل معلوم ہوتا ہے!

قارئین! غور فرمائیے کہ ہمارا تو نام ہی روشنی ہے، سوہنی کو ہماری دانش وَری اور کتابی کیڑا..... نہیں، کیڑی ہونے سے چڑ ہے! وہ تو بہن ہونے کی وجہ سے ہم لوگوں کی اتنی دوستی ہے، ورنہ کہاں وہ آٹھویں جماعت کی ناسمجھ بچی اور کہاں ہم دسویں جماعت کی دانش وَر ''بزرگ''۔

ویسے ہمارا خیال ہے کہ بزرگ کا لفظ ذرا مبالغہ ہو گیا ہے۔ ہاں اگر بھیا

ہم سے ایک سال بڑے ہونے کے بجائے ایک برس چھوٹے ہوتے تو ''بزرگ'' بننے یا کہلانے کے کچھ امکانات ہمارے بھی موجود تھے۔

خیر، ہم تو یہ بتا رہے تھے کہ کتاب اور ٹارچ، دونوں ہی ابا حضور نے ہم سے چھین لیے! ہمیں یوں لگا کہ جیسے ہم سڑک پر وہ بائیک ڈرائیور ہیں جو ٹریفک پولیس کے ہتھے چڑھ جائے اور بے سبب اس کا چالان ہو جائے! اگر یہ مثال ابا حضور پر چسپاں کی بھی جائے تو وہ ایسے ایمان دار اہلکار کہلائیں جسے رشوت بھی نہیں دی جا سکتی۔

اگلے دن ہماری عزیز سہیلی افشاں اور رابعہ نے ہمیں بڑی دل چسپ کہانیوں وغیرہ کی کتابیں لا کر دیں، مگر مسئلہ وہی وقت کا تھا! آج ہم نے پوری چالاکی سے کام لے کر تسلی کی کہ اماں جان اور ابا جان، دونوں ہی سو چکے ہوں، تب مطالعہ شروع کیا جائے۔ کمرے میں اُجالا کرنے کا خطرہ مول لینا بے وقوفی تھی، چناں چہ باہر کی ہلکی سی لائٹ کی کچھ کرنوں پر گزارا کر کے ہم نے مزے سے کتاب پڑھنا شروع کی، تاہم خوف کی تلوار مسلسل ہمارے سر پر لٹک رہی تھی۔ کتاب تو بہت اچھی تھی، خصوصاً رابعہ نے تو ہمیں صحابیات رضی اللہ عنہن کے قصوں والی کتاب دی تھی۔

مسئلہ یہ تھا کہ اوقات کار غیر قانونی تھے۔ دس بجے سب کو سو جانا ہوتا تھا اور ہم آدھے گھنٹے سے مطالعے میں مصروف تھے، بل کہ ایسے غرق ہو گئے تھے کہ چھاپا پڑنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔

جب کھٹ پٹ سے بھی ہماری یک سوئی میں کوئی فرق نہ پڑا تو اماں نے ایک ہاتھ ہماری کمر پہ ٹکا دیا۔ ہم اُچھل پڑے کہ اس نیم تاریک ماحول میں کیا چیز ہمارے اوپر آ گری ہے۔ چار چھپکلیاں تو ایک ساتھ نہیں گر سکتیں؟ ہم نے بمشکل گردن موڑ کر دیکھا تو چیخ ہی ماردی۔ ہماری چیخ سے اماں جان بھی ہل کر رہ گئیں۔

''کک..... کیا ہوا روشنی!؟'' انھیں ہماری خیریت کی طرف سے تشویش ہو گئی تھی۔

''آ..... آپ..... تو سو گئی تھیں اماں جان!؟'' ہم نے خوف پر قابو پا کر کہا۔

''اسے چھوڑو کہ میں سو گئی تھی یا جاگ رہی تھی، اندھیرے میں پڑھنے سے انسان کی نظر کم زور ہو جاتی ہے! تم ویسے بھی کل زردے کو سرسوں کے پھول کہہ رہی تھیں اور سوہنی بتا رہی تھی کہ تم کل چیکو کو گلاب جامن سمجھ کر کھانے والی تھیں؟'' امی نے قہر آلود نگاہوں سے ہمیں گھورا۔

''مم..... میں سو جاتی ہوں اماں جان!'' ہم نے جلدی سے کہا۔

''بالکل! مگر میرے کمرے میں چل کر! اٹھو اَب! تم ایسے نہیں

نہیں!'' اماں جان بولیں۔

''پیاری اماں! اب مان جاؤں گی اور ٹیوب لائٹ جلا کر پڑھوں گی۔'' ہم نے لجاجت سے کہا۔

''ہاں، مگر دس بجے سے پہلے تک! لیکن آج کی سزا تو پوری کرنی ہی ہوگی۔ اب اٹھ جاؤ۔''

اماں کے حکم پر ہم مجبوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اگلے دن ہم پر دو مقدمات اور قائم کیے جا چکے تھے:

''اماں جان! یہ روشنی تو بس نام کی ہی روشنی ہے۔ اسے گلاب جامن میں لگی ہوئی چیونٹیاں نظر نہیں آئیں۔ یہ ایسی تین گلاب جامن کھا گئی ہے اور اُمید ہے کہ رات تک اس کا منہ پھول کر گلاب جامن بن چکا ہوگا۔'' بھیا نے صحیح طریقے سے آگ لگائی۔

''اور اَماں جان! میری بھی سنیں۔ میں نے شرارت سے بجیا کو نقلی انگور پلیٹ میں رکھ کر دے دیے تھے، انھوں نے خوشے میں سے ایک انگور توڑا اور منہ میں ڈال لیا۔'' سوہنی ہنس رہی تھی۔

''اوہو بیٹے! بہت بُری بات ہے یہ تو؟ دھوکا دینے والی شرارت کیوں کی؟''

''اور اَماں! میں نے نقلی انگور دیکھے کب تھے؟ میں نے تو کتاب پڑھتے پڑھتے انگور توڑا تھا۔ یہ بھی اندازہ نہیں کہ میں نے کتنی طاقت لگائی ہوگی؟'' میں معصومیت سے بولی۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے، مگر مجھے بھی تمھاری نظر کی طرف سے تشویش ہے! ٹیسٹ کروانا ضروری ہو گیا ہے۔ کتاب ایسے پڑھتی ہو جیسے آنکھوں میں گُھسا ڈالو گی۔ آج تمھیں ڈاکٹرنی کے پاس چلنا ہے۔'' اماں جان نے وارننگ دے دی۔

''اماں جان! آپ سونف مصری پیس کر کھلاتو رہی ہیں مجھے؟'' ہم منمنائے، مگر ہماری ایک نہ سنی گئی اور وہ ہمیں آنکھیں ٹیسٹ کرانے لے گئیں۔

''اوہو! کیا سبھی اندھے..... ہمارا مطلب ہے کہ کم زور نظروں والے ہوتے جا رہے ہیں؟'' ہم نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا، کیوں کہ وہاں کافی رش تھا۔ کافی دیر بعد ہمارا نمبر آیا۔ ڈاکٹرنی صاحبہ شاید بہت تھک چکی تھیں۔ انھوں نے مشینی انداز میں اپنی مشین کے ایک پرزے کی طرف اشارہ کیا۔

''اس پر ٹھوڑی رکھ دو۔''

''نن..... نہیں ڈاکٹرنی صاحبہ! ہماری ٹھوڑی کم زور نہیں ہے، نظر میں شاید مسئلہ نکل آئے کچھ، کیوں کہ ہمیں.....''

"جی بیٹا! آپ کو بلیک بورڈ نظر نہیں آتا ہوگا۔ اب تک دس بچے بچیوں کی یہ شکایت ایک ہی دن میں سن چکی ہوں میں۔" ڈاکٹرنی صاحبہ نے چڑ کر ہمارا جملہ کاٹ کر ایک نیا جملہ ارشاد فرما دیا۔

"جی بالکل! وہ مجھے بلیک نظر نہیں آتا!" ہم نے حیرت سے کہا۔

"دیکھا؟ میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی!" وہ اپنی مہارت پر داد دیتے ہوئے بولیں۔

"مگر وہ پوری کلاس کو ہی...... بلیک نظر نہیں آتا۔" ہم نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"وہ کیوں؟ کیا سبھی کی نگاہ اتنی کم زور ہے؟ یہ آج کل کمپیوٹر، ٹی۔وی اور موبائل کے بے جا استعمال کا نتیجہ ہے۔" ڈاکٹرنی صاحبہ جوش سے بولیں۔

"نہیں جی! ہمارے کمرۂ جماعت میں وائٹ بورڈ استعمال ہوتا ہے!" ہم نے معصومیت سے کہا تو ڈاکٹرنی صاحبہ جھلّائیں:

"ٹھوڑی رکھو۔"

"ٹھوڑی ہی رکھوں؟" ہم نے ہچکچا کر ٹھوڑی کو فکس کر کے رکھنے کی ناکام کوشش شروع کر دی۔

"ظاہر ہے! آنکھوں کے ڈھیلے تو نکال کر رکھے نہیں جا سکتے؟ آپ ٹھوڑی فکس کریں گی تو عدسے آپ کی آنکھوں کے آگے آسکیں گے! اُفوہ......! آپ تو ایکسٹرا جینئس ہیں!" ڈاکٹرنی صاحبہ نے ہماری خاصی مہذب بے عزتی کر ڈالی۔

کچھ امتحانات سے گزار کر اُنھوں نے ہمارے لیے عینک تجویز کر ڈالی۔

"بچی کی نظر کم زور ہے، "مائنس ٹو" ہے۔" انھوں نے اَماں جان کو یہ بُری خبر سنائی تو اَماں جان کو بڑا دھچکا لگا۔ انھوں نے اسی وقت ہماری عینک کا آرڈر بھی دے ڈالا۔

"اماں جان! ہم چشمہ نہیں لگائیں گے، خوامخواہ ہمارے منہ پر چڑھا بیٹھا رہے گا وہ!" ہم نے احتجاج کیا۔

"اندھیرے میں پڑھنے کا نتیجہ بھگتو! ہزار دفعہ کہا تھا کہ جو کچھ پڑھو اُس پر روشنی پڑنی چاہیے اور اپنی آنکھوں کو براہِ راست روشنی پڑنے سے بچانا چاہیے!"

"اماں جان! اب بھلا روشنی خود ہی روشنی سے کیسے بچ پائے گی؟" ہم نے دلیل دی۔

"چھچھور پن نہ کرو۔ میرا خیال ہے کہ ڈوری والی عینک بنوانی پڑے گی، ورنہ دن میں دس بار تم اسے گم کر دیا کرو گی۔" اماں جان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ سب ٹھیک ہے اماں جان! مگر ہم اکیلے "چشمو" اور گھر بھر میں اکلوتے "عینکو" ہوں گے تو کیسے عجیب لگیں گے؟" ہم نے رونی صورت بنا کر کہا۔

"یہ سب پہلے سوچنے کی باتیں تھیں۔ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت!" اماں جان نے غصے میں بھاری سا محاورہ ہمیں کھینچ مارا۔

"او ہو اماں! یہاں چڑیاں اور اُن کے کھیت کا کیا ذکر ہے بھلا!؟"

"یہ ذکر ہے تمھاری کم زور آنکھوں کے احترام میں۔ میں اپنے تن درست اہلِ خانہ کو جبراً عینک نہیں لگوا سکتی، اس "خوب صورتی" کو تم اکیلے ہی "انجوائے" کرو۔" اماں جان نے ہمیں لاجواب کر دیا۔ یہ درست تھا کہ ہمارے علاوہ سبھی اہلِ خانہ تن درست تھے۔ (آنکھوں کے معاملے میں)

صبح شبنم پڑی گھاس پر چہل قدمی کرتے اور اندھیرے میں آنکھوں کو اُلّو کی طرح استعمال نہ کرتے تھے، جب کہ ہم صرف گاجر کے حلوے، مصری اور سونف پر اپنی آنکھوں کی پوری ذمے داری ڈالے ہوئے تھے۔ پڑھنے کا بے حد شوق جو اندھیرے اُجالے، دونوں سے بے نیاز تھا، ہماری بے احتیاط طبیعت کی وجہ سے بے وجہ رسوا ہو چکا تھا۔ یوں اب مصری سونف نے بھی سالہا سال کی وفاداری کے بعد ہمیں آخر کار دغا دے دی تھی۔ ہمیں تو یہ امید گاجر کے حلوے تک سے نہ تھی، جو صرف سردی کے سردی بکثرت بنتا تھا۔ اب تو عینک ہی ہمارے سر پڑ گئی تھی۔

اُف یہ عینک!

صرف دو دن ہی گزرے تھے کہ ڈوری والی عینک ہمارے گلے پڑ گئی۔ وہ ہر دو طرح سے ہمارے گلے پڑی تھی۔ ابا حضور کا قولِ زریں یہ تھا کہ "اب یہ ہمیشہ ہی لگانا ہوگی تمھیں۔" اور دوسری طرح یوں گلے پڑی تھی کہ ہم اس کی ڈوری کو اپنے گلے میں پھندے کی طرح ڈالنے پر مجبور تھے۔

عینک نامی یہ "مشین بینائی" ہماری آنکھوں کے آگے یوں دیوار بن کر بیٹھی کہ ہم اصلی دنیا کو، ہمارا مطلب ہے کہ دنیا کو "بلاواسطہ" دیکھنے سے محروم ہو گئے۔ عینک صرف ہماری آنکھوں پر ہی قابض نہ تھی، بل کہ اپنے پورے جسم کے ساتھ پھیل کر ناک اور کان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ ہمیں سب سے پہلے ناک میں گدگدی ہوئی، پھر آنکھ میں بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ ابھی یہ بے چینی بڑھی ہی تھی کہ کان میاں بھی ناراض ہو گئے۔ ہم آئینے کے سامنے اپنے چہرے کی "حسین تبدیلی" دیکھنے کو کھڑے ہی ہوئے تھے کہ ہمیں ایسا لگا جیسے ہمارا کان شکوہ کر رہا ہو:

"ارے چشمو! فائدہ ہے آنکھ کا اور وزن سارا مجھ پر ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟" ہمیں اچانک کان میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اور پھر

بوجھل پن سے سخت اُلجھن ہونے لگی۔ ناک پر ہونے والی گدگدی اب تھکن میں بدل چکی تھی۔ ہم نے عینک کے نخرے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اُسے اتار کر اُس کی لمبی ٹانگیں موڑ کر تہ کر دیں۔ وہ ڈوری کے ساتھ ہمارے گلے میں یوں لٹک گئی جیسے بچپن میں سوہنی کا ''نپل'' ایک ڈوری کے ساتھ اس کے گلے میں لٹکا رہتا تھا۔

''ہی ہی ہی..... میں تو بچی لگ رہی ہوں اسے گلے میں لٹکا کر۔'' ہم نے خود کلامی کی۔

اب گلے میں وزن بڑھ چکا تھا اور کان والا احتجاج گلے میں آ گیا تھا۔ ہم جھنجھلا کر اماں جان کے پاس آئے جو بہت اچھی روشنی میں ایک مشکل سا انگریزی ناول پڑھنے میں مصروف تھیں۔

''اماں جان! یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی ہے؟'' ہم نے رونی صورت بنالی۔

''ارے! یہ گلے میں لٹکانے کے لیے نہیں ہے۔ صحیح طرح لگاؤ آنکھوں پر، ورنہ تمھارا دو وقت کا کھانا بند کر دوں گی۔'' اماں جان نے زندگی میں پہلی بار ہمیں اتنی سخت دھمکی دی تھی، ورنہ کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ایک وقت کا کھانا بند کرنے کی بھی محض رسمی دھمکی ہی کبھی ملی ہو۔ نجانے وہ اتنی ظالم کیوں ہو گئی تھیں؟

''اماں جان! آپ اس کی خاطر ہمارا کھانا بند کر سکتی ہیں؟'' ہم نے اس منحوس عینک کی طرف اشارہ کر کے اسے نفرت سے گھورا۔

''اس کی خاطر نہیں، تمھاری خاطر! نظر مزید کمزور ہو جائے گی، مجھے تشویش ہو رہی ہے۔'' اماں جان نے اپنی کتاب بند کی اور کھڑے ہو کر ہمیں وہ عینک ایسے پہنانے لگیں جیسے وہ ہمیں موتیوں والا نازک ہار پہنا کر اُس کا لاک بڑے اہتمام سے لگاتی تھیں۔

''عینک پہن کر تو ہم ذرا بھی خوب صورت نہیں لگ رہے تھے۔ ہار تو گلے میں بہار دکھاتا تھا اور یہ عینک اور وہ بھی، ڈوری والی؟ ہونہہ، ایسا لگتا ہے جیسے ہم قربانی کے بکرے ہیں!'' ہم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

شام تک بھیا نے ہمیں غائب دماغ پروفیسر کا لقب دے دیا تھا، حالاں کہ روز کی طرح آج ہم کچھ بھی رکھ رکھ کر نہ بھولے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اے کاش! یہ ڈوری نہ ہوتی تو ہم اس عینک کو ہی جگہ جگہ رکھ کر بھول جاتے اور کئی گھنٹے اسے پہننے..... ہمارا مطلب ہے..... لگائے رکھنے سے بچ جاتے۔

اگلے دن غائب دماغ پروفیسر کا مخفف صرف ''غائب'' رہ گیا تھا۔ ہمیں بہت غصہ آیا، مگر اِسی پر شکر کیا کہ ''عینکو'' اور ''چشمو'' جیسے عظیم القاب ایک دفعہ دے دینے کے بعد بھیا شاید بھول گئے تھے۔ وہ تو کئی دن بعد پتا چلا کہ ابا حضور نے بھیا کو جھاڑ پلا دی تھی اور سمجھایا بھی تھا کہ بُرے القاب سے یاد کرنا بُروں کا کام ہے۔

ہر چند کہ ہم نے سمجھایا اور بھیا پر دلیل کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ ''غائب'' بھی بُرا لقب ہے، مگر وہ نہ مانے اور دلیل دے ڈالی:

''دیکھو غائب! صبح نماز پڑھ کر تلاوت کرنے کے بجائے تم لحاف میں غائب ہو جاتی ہو، پھر باورچی خانے میں غائب، پھر اسکول میں تو کافی دیر تک غائب! شام کو بھی نظر نہیں آتیں۔''

''اس لیے نظر نہیں آتی کہ آپ خود کھیلنے ''غائب'' ہو جاتے ہیں! اس حساب سے تو آپ کا بھی ''غائب'' نام رکھنا چاہیے!'' ہم نے بلند آواز میں احتجاج کیا۔

''اوہ!'' بھیا سوچ میں پڑ گئے۔ انھیں بالکل بھی یہ نیا لقب اپنے اوپر شفٹ کرنا پسند نہیں آیا تھا، لہٰذا وہ نئی دلیل سوچ رہے تھے کہ اب کیا کہا جائے۔ ابھی ہم میدان مار کر مقابلہ جیتنے ہی والے تھے کہ فون کی گھنٹی چیخ اُٹھی۔ ہماری عزیز سہیلی کا فون تھا۔ سلام کرتے ہی وہ گویا ہوئی:

''ہاں چشمو! ہوم ورک کر لیا آج کا؟ میرا کام.....'' ابھی وہ اتنا ہی بول سکی تھی کہ ہم پھٹ پڑے:

''یہ چشمو تم نے کس کو کہا؟''

''اوہ سوری! عینکو!'' وہ قہقہہ لگا کر بولی اور ہم نے کھٹ سے فون بند ہی کر دیا۔

ابھی ہم جلے بھنے بیٹھے تھے کہ بھیا گھر میں داخل ہوئے:

''غائب! یہ لو، تمھارے لیے سرمہ اور تازہ گاجریں لے آیا ہوں، فائدہ دیں گی۔'' بھیا نے شرارتی مسکراہٹ سے کہا۔

''میں نے سمو سے منگوائے تھے اور آپ یہ اُٹھا لائے۔'' ہم نے جُز بُز ہو کر کہا۔

''اس کا سیزن آف نہیں ہوتا، مگر گاجر کا موسم اب جانے کو ہے! سرمہ اصلی مل گیا قسمت سے، بس میں لے آیا تمھارے لیے۔'' بھیا ہنس رہے تھے اور ہم انھیں قہر بار نظروں سے گھور رہے تھے۔

''اوہو، دھو لاتا ہوں تمھارے لیے۔'' وہ بڑی سعادت مندی سے جھکے اور گاجریں اُٹھا کر دھوئیں، پھر بڑے سلیقے سے شیشے کی پلیٹ میں سجا لائے۔ ہمارا لڑائی جاری رکھنے کا موڈ نہ تھا۔ اماں جان نے ہمیں یہ گُر سکھایا تھا کہ اگر چڑانے والے بھائیوں سے بہنیں چڑنا چھوڑ دیں تو وہ بور ہو کر خود ہی چھیڑ خانی چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم نے یہ فارمولا بڑا کارگر پایا تھا، چناں چہ دُھلی ہوئی گاجریں مزے لے لے کر کھانا شروع کر دیں اور سموسوں پر ''غائبانہ'' فاتحہ پڑھ دی۔

''تم تو ایسے گاجریں کھا رہی ہو جیسے..... جیسے گائے بھینس کھاتی ہیں، ہاہاہا!'' بھیا نے اگلا تیر آزمانے کا فیصلہ کیا اور ہمارے لیے صبر کرنا کافی مشکل ہو گیا، تاہم، ہم نے پھر بھی صبر سے کام لیا۔

''کوئی گائے بھینس گاجریں دھو کر کھاتی ہو گی بھلا؟'' ہم نے منہ توڑ جواب دے ڈالا۔

''تم کب دھو کر لائی ہو؟ میں دھو کر لایا ہوں۔'' وہ فوراً بولے۔

''کوئی بھی دھوئے، دھلی ہوئی گاجریں تو ہیں نا!'' ہم نے مزے سے گاجریں چباتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو، اگر میں گائے بھینس کو بھی دھو کر کھلا دوں؟ تب تو گائے بھینس دھلی ہوئی گاجر ہی کھا لے گی نا! یہ فرمائش تھوڑا ہی کرے گی کہ مٹی میں لوٹ پوٹ کر کے گندی کر کے لاؤ؟'' بھیا نے دو گز فاصلہ بڑھا کر ہمارا صبر آزمایا۔ ہم پھر بھی کچھ نہ بولے تو بھیا نے آخری کوشش کی:

''روشنی! یہ گائے بھینس کا وزن اتنا کیوں ہوتا ہے؟ گاجر وغیرہ کی وجہ سے ہوتا ہے کیا؟'' بھیا نے بھاگنے کی پوزیشن لیتے ہوئے آخری حملہ کیا اور ہم گاجر چباتے رُک گئے۔

''شاید ہماری ''اسپیشل'' بے عزتی ہوئی ہے؟'' ہم نے دل میں سوچا، مگر ہمت کر کے صبر کیا اور خود کو تھپکی دی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔''

بھیا کا منصوبہ ناکام ہو گیا، کیوں کہ ہمیں پھر سے امی کی نصیحت ہاتھ آ گئی تھی اور بھیا پسپا ہو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ پھر سے قریبی کرسی سنبھال کر بیٹھ گئے۔

''یہ چشمہ نامی مشین جو ہے، دیکھنے والی مشین؟ کیسی محسوس ہو رہی ہے اب تمھیں؟'' بھیا نے ہمدردی سے کہا۔

''آہ! کیا بتاؤں؟'' ہم نے یک سوئی حاصل کرنے کے لیے گاجریں رکھ دیں اور رُخ بھیا کی طرف کر دیا۔

''آہ! کیا بتاؤں؟'' ہم نے پھر کہا۔

''اب بتا بھی دو۔'' بھیا جھنجھلائے۔

''چشمہ نامی یہ دیکھنے کی مشین آنکھوں سے اسٹارٹ لے کر ناک، کان پر یوں براجمان ہوتی ہے جیسے کوئی بادشاہ بڑی شان سے تختۂ شاہی پر بیٹھا ہو۔'' ہم نے آہ پھر بھری۔

''تختۂ شاہی؟ اری بے وقوف! تختِ شاہی کہتے ہیں، تختہ تو چھوٹا ہوتا ہے۔'' بھیا نے ہماری اردو ٹھیک کی۔

''ہمارے ناک، کان اور آنکھیں کوئی چیز بھی اس بھیانک مشین کا تختہ بننے کی اہل نہیں، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، معصوم کان اور چھوٹی سی ناک.....''

''چینی قوم سے مماثل!'' بھیا نے بیچ میں ٹانگ اڑائی، مگر ہم نے نظر انداز کر کے اپنی بات جاری رکھی۔

''بھلا، یہ معصوم ننھی منی چیزیں اتنے بڑے چشمے کا تختہ کیا کہلائیں گی؟ تختہ ہی کہلائیں گی۔'' ہم جل بھن کر بولے۔

''اچھ..... اچھا، ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟'' بھیا نے دل چسپی سے پوچھا۔

''تختۂ شاہی پر یہ چشمہ بڑی شان و شوکت سے براجمان ہوتا ہے اور..... اور آگے میں جو بول رہی تھی بار بار کی مداخلت کی وجہ سے بھول گئی ہوں۔''

ہم نے بھیا کو اَخلاق کی مار مارنے کی ایک کم زور سی کوشش کی اور دوبارہ گاجر چبانے میں مصروف ہو گئے۔

''تمھاری عینک کے شیشے کچھ زیادہ ہی بڑے نہیں ہیں؟'' بھیا نے مدّبرانہ انداز میں کہا۔

''اور کیا! میرے گال بھی دکھ جاتے ہیں اس چشمے کی وجہ سے۔'' ہم مظلوم شکل بنا کر بولے۔

''اوہو، اتنی جُگالی سے تو گال دکھتے نہیں اور بے چارے معصوم سے چشمے سے گال دکھ گئے۔'' بھیا نے موقع پاتے ہی حملہ کیا۔

''آپ لگائیں؟'' ہم جل کر بولے۔ اسی اثنا میں سوہنی، سونف اور مصری کی بڑی سی شیشی ہمیں تھما گئی۔

''امی نے کہا ہے کہ اپنے کمرے میں رکھیں اور چار ٹائم کھانی ہے، تاکہ چشمے کا نمبر مزید نہ بڑھے۔ ابھی تازہ بنائی ہے یہ۔'' سوہنی یہ بتا کر چلی گئی اور بھیا نے باتوں کے دوران میں تیزی سے مصری اور سونف کے سفوف پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ ہمیں لگا، چوتھائی بوتل تو ضرور خالی ہو چکی ہے۔ ہم نے جلدی سے اپنی لذیذ دوائی اٹھائی اور قبضے میں کر لی۔

''بھیا! گائے بھینس کا لقب ہمیں ''سوٹ'' نہیں کرتا، بل کہ.....''

''لیکن گائے بھینس تو مؤنث ہوتی ہے۔'' بھیا پوری بات سمجھ کر برجستہ بولے۔

''چلیں، بیل اور بھینسا ہی سہی۔'' ہم نے جل کر کہا اور بھیا کو گھورا۔

''محاورے نہ بگاڑو۔'' بھیا بولے۔

''چلیں چھوڑیں بھیا! لڑائی بے فائدہ ہوتی ہے۔ میرے دماغ میں عینک والا ایک زبردست آئیڈیا آیا ہے۔'' ہماری آنکھیں چمک اٹھیں۔

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ دیکھنے والی یہ مشین ذرا جدید بنائی جائے۔'' ہم نے ایک فٹ اُچھل کر کہا۔

''یعنی اب تم چشمے کی کمپنی کھولو گی؟'' بھیا کو ہماری ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا۔

''نہیں، مگر ہم کمپنی والوں کو آئیڈیا تو دے سکتے ہیں۔ کروڑوں کا آئیڈیا!''

''ہاہاہا! اچھا چلو، بتاؤ ذرا۔'' بھیا نے مذاق اُڑانے کے انداز میں پوچھا۔

''جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ شیشے یا پلاسٹک کے دو ٹکڑے، اپنے پلاسٹک یا دھات کے جسم کے ساتھ آنکھ کا سفر کرتے کرتے ناک اور پھر کان کی سرحد بھی عبور کر لیتے ہیں اور اپنے پورے جسم کو کسی شیر کی طرح پھیلا کر بیٹھے رہتے ہیں اور یوں منہ کا کافی ''ایریا'' گھیر لیتے ہیں، انھیں کم جگہ میں محدود کرنا چاہیے۔'' ہم جوش سے بولے۔

''مم..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ عینک لگانے سے دماغ پر بُرا اثر پڑ جاتا ہے؟'' بھیا نے افسردگی کی کام یاب اداکاری کی۔

''مذاق چھوڑیں بھیا! چھوٹی چھوٹی تو آنکھیں ہوتی ہیں جن کی ہمدردی میں بے چارے کان اور ناک، سبھی بے دم ہو جاتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ یہ شیشے ہوں پانچ کے سکے جتنے اور اِن کے لمبے لمبے ہاتھ نہ ہوں، یعنی پلاسٹک اور دھاتی جسم کی جگہ انھیں مضبوط ڈوری سے کنٹرول کیا جائے۔'' ہم نے بڑے جذبے سے کہا۔

''ہی ہی ہی! پانچ کا سکہ، ذرا چھوٹا نہ ہو جائے گا۔'' بھیا ہنس پڑے۔

''ارے نہیں، کسی کی ذرا بڑی آنکھ ہو تو وہ چھوٹے والے مستطیل بسکٹ یا چھوٹے گول بسکٹ جیسا سائز بھی بنوا سکتا ہے۔'' ہم نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''اور بھی اچھا ہو اگر شیشے کی جگہ بسکٹ ہی لگوا لیے جائیں، جب زیادہ بھوک لگی تو عینک توڑ توڑ کر کھالی۔ چھوٹے گول بسکٹوں میں تو سوراخ بھی پائے جاتے ہیں۔ گویا ڈبل فائدہ کہ آپ سب کو دیکھیں اور آپ کو کوئی نہ دیکھ پائے۔'' بھیا بولے۔

ابا گھر میں آ چکے تھے۔ آواز نہ دیتے تو یہ نشست نہ جانے کب تک مزید جاری رہتی۔

ایک ماہ گزرا تو چشمے پر ہزار آفات آ چکی تھیں۔ محلے کا شیر خوار دانیال نئی چیز مجھ روشنی کے منہ پر پا کر جھپٹا مار بیٹھا۔ ڈوری ٹوٹ گئی اور ایک طرف کا عینک کا شیشہ بھی ''کریک'' ہو گیا، پھر خالہ کے بچے آئے تو اُنھوں نے

بقیہ صفحہ نمبر 63 پر

لاحاصل زندگی

غلام حسین میمن۔ حیدرآباد

''تم اس ملازمت کو کیوں چھوڑنا چاہتے ہو؟'' سلیم نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا رکھا ہے اس میں!؟ سارا دن بچوں کے ساتھ سر کھپاؤ اور پھر تنخواہ بھی کم۔'' عادل نے بے زاری سے جواب دیا۔

''کم تنخواہ؟'' سلیم نے حیرت سے کہا۔ ''یہ کوئی ملازمت نہیں ہے۔ ہم استاد صرف بچوں کو تعلیم ہی نہیں دے رہے ہوتے، بل کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم ایک اچھا معاشرہ تشکیل دیں۔''

''ہونہہ۔'' عادل نے حقارت سے دیکھا اور کچھ کہے بغیر اِسٹاف روم سے نکل گیا۔

تین دن بعد پتا چلا کہ عادل نے اسکول سے استعفیٰ دے دیا ہے۔

عادل کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا۔ اس نے بہت مشکل سے تعلیم حاصل کی اور پھر اپنی قابلیت کے بل بوتے پر وہ ایک سرکاری اسکول میں استاد بن گیا۔ تین سال میں ہی اس کا جی بھر گیا۔ شاید اُس کی ضروریات اور خواہشات کو پوری کرنے کے لیے یہ ملازمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

عادل نے اس کے بعد متحدہ عرب امارات کی جانب دیکھا اور اپنے حالات کی بہتری کے لیے وہاں کی اڑان بھری۔ وہاں بھی دل نہ لگا تو چھے ماہ بعد وہ دوبارہ اپنے شہر واپس آ گیا۔

اب عادل کا ایک نیا انداز سامنے آیا۔ اس نے اپنے کزن دانیال کو یہ پیش کش کی کہ میں ایک منافع بخش کاروبار شروع کر رہا ہوں، جس میں منافع ہر پندرہ دن بعد دوگنا ہو کر ملتا ہے۔ اس کے کزن کے منہ میں پانی آ گیا۔ اس نے اپنی ساری جمع پونجی اس کے حوالے کر دی۔ ٹھیک پندرہ دن بعد دانیال کو اُس کی اصل رقم دگنی ہو کر ملی تو خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ خبر جب دانیال کے دوستوں تک پہنچی تو اُنھوں نے بھی اس موقع کو ضائع نہ جانے دیا۔ انھیں بھی پندرہ دن بعد رقم دگنی ہو کر مل گئی۔

یہ بات خوش بُو کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ لوگ اس کے کاروبار میں شراکت داری کے لیے آنے لگے اور کسی کو بھی مایوسی نہیں ہوئی۔ پاکستان کی تاریخ کا یہ کردار ''ڈبل شاہ'' کے نام سے معروف ہوا اور چند ماہ بعد ہی وہ دولت میں کھیلنے لگا۔

یہ بات لاکھوں اور کروڑوں کی نہیں، بل کہ اس کے پاس جمع کرائے گئے اثاثوں کی رقم سات ارب تک جا پہنچی تھی۔ اس کے ذہن میں اگلا مرحلہ ملک سے فرار کا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ فرار کے منصوبے پر عمل کرتا، خفیہ اداروں کی کارروائی کے بعد وہ قانون کی گرفت میں آ گیا۔ اس کے مختلف ٹھکانوں پر چھاپے مارے گئے تو وہاں سے تین ارب روپے برآمد ہوئے۔ باقی کے چار ارب روپے کہاں تھے؟ پولیس نے سر توڑ کوشش کی۔ عادل پر بے تحاشا تشدد کیا گیا، مگر پولیس کو مایوسی ہوئی۔

اب معاملہ عدالت تک پہنچا۔ عدالت میں تین سال تک سرکاری وکیل کی جرح اور وکیل صفائی کے درمیان بحث کے بعد عدالت نے اسے عوام کی رقم خرد برد کرنے کے الزام میں چودہ سال قید کی سزا سنائی۔ عادل نے یہ سزا خوش ہو کر سنی۔ اب وہ مستقل پولیس کی حراست میں تھا، جہاں عدالت میں پیش ہونے کا چکر بھی ختم ہوا۔ اس نے اس سزا کے خلاف اپیل بھی نہیں کی۔ جیل میں دن اور رات کو دو دِن شمار کیا جاتا ہے۔ اس طرح چودہ سال کی سزا باہر کے سات سال کے برابر تھی، جس میں تین سال پولیس کی حراست کے بھی شمار کیے گئے۔ باقی کے چار سال جیسے ہی ختم ہوئے وہ باہر کی دنیا میں موجود تھا۔

جیل کے باہر دروازے پر کھڑے ہو کر اُس نے گہرا سانس لیا اور بے حد مسرت سے آسمان کی جانب دیکھا۔ خوشی سے اس کا اَنگ اَنگ مسرور تھا اور کیوں نہ ہوتا، باقی کے چار اَرب روپوں کا وہ اب بلاشرکت غیرے مالک تھا۔ عدالتی کارروائی اور سزا کے بعد کوئی بھی اس سے اپنی رقم

بقیہ صفحہ نمبر 41 پر

علامہ اقبالؒ

ابن بشیر رحمانی۔ لاہور

شمعِ بزم شاعری اقبالؒ تھے
تیرگی میں روشنی اقبالؒ تھے

پاک گلشن جن کا سچا خواب تھا
وہ صدائے آگہی اقبالؒ تھے

جن کی آنکھوں میں تھا آزادی کا نور
وہ انوکھی چاندنی اقبالؒ تھے

دشمنوں سے بھی محبت تھی اُنھیں
دوستوں کی دوستی اقبالؒ تھے

ظلم ہو یا جبر وہ ڈٹ کر رہے
کتنے اندر سے قوی اقبالؒ تھے

جن کو شاہینوں سے نسبت تھی نویدؔ
جانتے ہو تم ، وہی اقبالؒ تھے

ظلمتوں کے سامنے ڈٹ کر رہے
ظلمتوں سے دشمنی اقبال تھے

ان کی عظمت کا زمانہ معترف
ایک سچے آدمی اقبال تھے

چھوٹے بچوں کے لیے ایک خوب صورت کہانی

محافظ

محمد ندیم اختر۔لیہ

''کٹ.....کٹ.....کٹاک۔''

''ارے کٹوبی! کتنی بار کہا ہے کہ تمھاری کٹ.....کٹ.....کٹاک کی آواز جب اچانک ہمارے کانوں سے ٹکراتی ہے تو ہماری جان نکال دیتی ہے۔'' گھر کا پالتو کتا ڈبو دم ہلاتے ہوئے غرایا۔

''ارے چل! کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا!'' بڑی کلغی والی گھر کی مرغی نے ایک ٹانگ ڈبو کی جانب اٹھاتے ہوئے ہمیشہ کی طرح ڈبو کو ڈانٹ دیا۔ ڈبو، کٹوبی کے پنجوں سے بہت ڈرتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو ایک ہی حملے میں اس کلغی والی موٹی کٹوبی کی تکا بوٹی ایک کر دیتا، لیکن کیا کرتا! جس مالک کا کھاتا تھا اس کی پالتو کٹوبی کو کیسے مار سکتا تھا۔

''اور ہاں، ہر وقت یہ دروازے پر سر ٹکائے سویا نہ رہا کر۔ میری طرح مالک کے کبھی کام بھی آیا کر۔'' کٹو نے چونچ بسورتے ہوئے اپنے بڑے سے پَر پھیلائے اور ڈبو کو دَکھیلتی ہوئی گھر سے نکل کر سامنے کھیتوں کا رُخ کرنے لگی۔

''مجھے ہر وقت کوستی رہتی ہو۔ سارا دن دانہ چگنے اور کٹ.....کٹ.....کٹاک کے علاوہ کرتی کیا ہو تم بھی؟'' ڈبو بھی شاید آج کٹوبی سے حساب بے باک کرنے کے چکر میں تھا۔

.....☆.....

یہ گاؤں کے ایک کسان کا گھر ہے۔ کسان نے گھر میں مرغیاں اور خرگوش پال رکھے ہیں، جب کہ ان کی حفاظت کی نیت سے سفید رنگ کا ایک کتا، جس کا نام ڈبو ہے، وہ بھی پال رکھا ہے۔ کھیتوں کے درمیان اس کسان کا گھر ہے۔ گھر میں کسان کی بیوی اور اُس کے دو بچے ہیں۔ کسان نے باقی جانوروں کے ساتھ ساتھ سفید رنگ کا ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا بھی بڑے شوق سے پالا ہوا ہے، جس پر وہ روزانہ زین ڈال کر سواری کرتا ہے۔ مرغیاں تو درجن بھر ہوں گی، لیکن ان مرغیوں میں کٹوبی کو جو مقام حاصل ہے بھلا باقی مرغیوں کو کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کٹوبی تمام مرغیوں سے زیادہ فربہ ہے اور پھر اَنڈوں کے موسم میں وہ انڈے بھی خوب دیتی ہے۔

کسان، اُس کی بیوی اور اُس کے بچوں کو کٹوبی اس لیے بھی بہت پیاری ہے کہ جب کٹوبی کی ماں، جو ہو بہو کٹوبی جیسی تھی، سردیوں کے موسم میں انڈوں پر بیٹھی تھی تو کسان کی بیٹی نے ایک دن چپکے سے ایک انڈہ اٹھا لیا تھا اور وہ اپنے بھائی کے ساتھ اس انڈے کو لے کر کھیتوں کی جانب بھاگ گئی تھی۔ وہاں جا کر دونوں بہن بھائیوں نے وہ انڈہ توڑ ڈالا۔ جیسے ہی دونوں بہن بھائیوں نے انڈہ توڑا اُس میں سے ایک چوں.....چوں کرتا چوزہ نکلا۔ وہ چوزے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اُسے اپنے ننھے ہاتھوں میں اٹھائے بھاگتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ اتنی دیر میں کٹوبی کی ماں کی نظر اُس چوزے پر پڑ گئی اور وہ پَر پھیلاتی ہوئی کٹ.....کٹ.....کٹاک کرتی ان کی طرف بھاگی۔ انھوں نے ڈرتے ہوئے اس چوزے کو چھوڑ دیا۔ انھوں نے کسان اور اپنی ماں کو بتایا کہ یہ جو چوزہ بی مرغی کے ساتھ دڑبے میں جا رہا ہے، یہ اُنھوں نے انڈہ توڑا تو اُس میں سے نکلا ہے، پھر اُنھوں نے اگلے دن دیکھا تو بی مرغی نہ صرف اس ایک چوزے، بل کہ

درجن بھر دوسرے چوزے ساتھ لیے دڑبے سے باہر آئی۔ وہ پَر پھیلائے کسان کے صحن میں کٹ..... کٹ کرتی گھوم رہی تھی، لیکن ان سب چوزوں میں وہ چوزہ سب سے موٹا تھا، وہ الگ ہی پہچان رکھتا تھا۔ اس طرح وہ سارے گھر والوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا، پھر ایک دن رانی کھیت کی بیماری آئی اور تمام چوزے اور بی مرغی اس بیماری کا شکار ہو کر چل بسے، لیکن وہ موٹا چوزہ حیرت انگیز طور پر اُس بیماری کے حملے سے بچ گیا۔

وقت گزرتا گیا، وہ چوزہ بڑا ہوتا گیا اور کلغی والی مرغی کی شکل میں آ گیا، جس کا نام سب گھر والوں نے کٹو رکھا، پھر ایک دن کسان اپنے گھر میں درجن بھر چھوٹی عمر کی مرغیاں اور مرغے لے آیا۔ ان مرغیوں اور مرغوں کے لیے نیا ڈربا تیار کرایا، جب کہ کٹو کے لیے الگ سے ڈربا رہنے دیا، پھر ایک دن کٹو نے انڈے دیے اور سردیوں کے موسم میں اپنے انڈوں کو سینے لگی، پھر سب گھر والوں نے دیکھا کہ ان انڈوں میں سے درجن بھر چوزے نکلے اور پورے گھر میں کٹ..... کٹ..... کے ساتھ چوں..... چوں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ اس دن کے بعد کٹو کے نام کے ساتھ ''بی'' کا اضافہ ہوا اور وہ کٹو سے کٹوبی ہو گئی۔

.....☆.....

''ارے نکھٹو ڈبو! مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کیا کرتی ہوں۔ دیکھتے نہیں، میرے انڈوں سے یہ گھر والے ناشتا کرتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے، میرے چوزے گھر میں چوں..... چوں کی آوازوں سے گھر والوں کا دِل لبھاتے ہیں۔''

کٹوبی نے اکڑتے ہوئے اپنی خوبیاں گنوائیں۔ ''اور تم ہمیشہ بھونکتے ہو، کھاتے ہو اور نکھٹو بنے سوئے رہتے ہو۔'' کٹ..... کٹ..... کٹاک کی آواز سے اس نے غصے سے اپنی چونچ چڑائی اور کھیتوں کی جانب چل دی، جب کہ ڈبو غراتا ہوا دروازے کے سامنے سے اٹھا اور اپنی دم ہلاتا ہوا کنویں کی جانب بڑھ گیا، جہاں بیلوں کی جوڑی کنویں کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ راستے میں اڑیل گھوڑا اُسے دیکھ کر ہنہنایا:

''ڈبو! کٹوبی کہتی تو ٹھیک ہی ہے کہ تم کسی کام کے نہیں، ہر وقت کھاتے ہو اور سوئے رہتے ہو۔'' اڑیل گھوڑے کی بات سن کر ڈبو ایک بار پھر غرایا اور کنویں کے پاس ہی درخت کے نیچے لیٹ کر کٹوبی کو غصے سے دیکھنے لگا، جو اپنے بچوں کے ساتھ کھیت میں چگ رہی تھی۔ ڈبو کبھی اڑیل گھوڑے کو غصے سے دیکھتا اور کبھی کٹوبی اور اُس کے چوزوں کو، اُسے اپنی ہتک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا میں واقعی کسی کام کا نہیں ہوں۔ اس نے ایک نظر اپنے جسم پر ڈالی، واقعی کھا کھا کر اُس پر کتنی چربی چڑھ گئی ہے۔ بھاگتے ہوئے اس کی سانس بھی پھولنے لگتی ہے۔ اس نے اپنا پنجہ زمین پر مارا اور افسردگی سے درخت کے نیچے ہی لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

''کٹ..... کٹ..... کٹاک.....'' کٹوبی کی چیخ اتنی ہول ناک تھی کہ اڑیل گھوڑا ہنہنایا، کسان اپنا بیلچہ پھینک کر کٹوبی کی جانب بھاگا۔ ڈبو کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہی جو منظر دیکھا وہ واقعی دل دہلا دینے والا تھا۔

''کٹ..... کٹ..... کٹاک..... بچاؤ..... بچاؤ.....'' کٹوبی پَر پھیلائے اپنے پروں کے نیچے اپنے چوزوں کو چھپائے اس چیل پر پوری قوت سے اچھلی۔ ڈبو کو یہ سمجھنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ لگی کہ ایک چیل نے کٹوبی کے چوزوں پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا کہ میں بھلا کیوں اسے اور اُس کے بچوں کو بچاؤں، اسے بھی تو سبق ملے، لیکن دوسرے ہی لمحے اسے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ مالک کیا کہے گا، کیا میں واقعی کسی کام کا نہیں ہوں۔ بس یہی وقت ہے کہ جب مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ میں نکما اور نکھٹو نہیں، بل کہ ان سب کا محافظ ہوں۔ یہ سوچ کر ڈبو غرایا اور بھوں..... بھوں کرتا اس چیل کی جانب لپکا۔ ڈبو کی آواز سن کر چیل کے پنجوں سے کٹوبی کا چوزہ زمین پر آن گرا، اِتنی دیر میں ڈبو اُن کے قریب آ گیا اور چیل دور آسمانوں کی جانب پرواز کر گئی۔ کسان بھی بھاگتا ہوا اُن کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کٹوبی اور اُس کے چوزے سہمے ہوئے تھے۔ کسان نے نزدیک پہنچ کر زخمی چوزے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا۔ ڈبو کو قریب دیکھ کر کٹوبی نے تشکرانہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

جہاں وہ اس کی جانب تشکرانہ انداز میں دیکھ رہی تھی وہاں اس کی آنکھوں میں شرمندگی بھی تھی کہ جسے وہ نکھٹو اور نکما کہتی رہتی تھی، آج اس کی وجہ سے ہی اس کے چوزے کی جان بچی تھی۔ کسان نے پیار سے ڈبو کو پچکارا تو وہ اپنی دم ہلاتا ہوا کسان کے پیروں میں لوٹنے لگا۔ جب یہ سب گھر کی جانب لوٹ رہے تھے تو دور کھڑے اڑیل گھوڑے نے ہنہناتے ہوئے ڈبو کو سلامی اور کٹوبی کو مبارک باد دی۔

بس پھر وہ دن اور آج کا دن، دوبارہ کبھی کٹوبی اور ڈبو کا جھگڑا نہیں ہوا اور سارے جانور یہ جان گئے کہ کوئی بھی یہاں نکما اور نکھٹو نہیں، بل کہ ہر جانور کی کوئی نہ کوئی خوبی ہے، جس کی وجہ سے وہ کسان کے پاس رہتے ہیں اور کسان ان سے پیار کرتا ہے۔

خوش خبری

مقابلۂ خوش خطی

طلباوطالبات کے لیے انعامات جیتنے کے مواقع

بارہ مہینے
بارہ انعامات

انعامات:

اول آنے پر 1000 روپے / دوم آنے پر 700 روپے

سوم آنے پر 500 روپے

مقابلے میں شریک ہونے کے لیے مندرجہ ذیل فن پارے کو لکھیے۔ جو قاری اس فن پارے کو عمدہ انداز میں لکھنے میں کام یاب ہوگیا، وہ انعام کا حق دار ہوگا۔

تو پھر دیر کس بات کی! اٹھایئے کاغذ اور قلم، کیجیے مشق.....اور ہمیں جلد از جلد ارسال کر دیجیے۔

مقابلے سے متعلق ضروری ہدایات:

☆ کمپیوٹر پیپر (A-4 سائز) صفحہ استعمال کیجیے۔

☆ فن پارے کو لکھنے کے لیے فونٹین پین، پنسل، کٹا ہوا پین اور کٹا ہوا مارکر استعمال کر سکتے ہیں۔

☆ کالی اور نیلی روشنائی استعمال کیجیے، کوئی اور رنگ بالکل استعمال نہ کیجیے۔

☆ صفحے کے چاروں جانب سے تقریباً ایک ایک اِنچ کا فاصلہ رکھ کر نمونہ تحریر کیجیے۔

زیرِ انتظام
شعبہ خوش خطی، البدر ہائر سیکنڈری اسکول

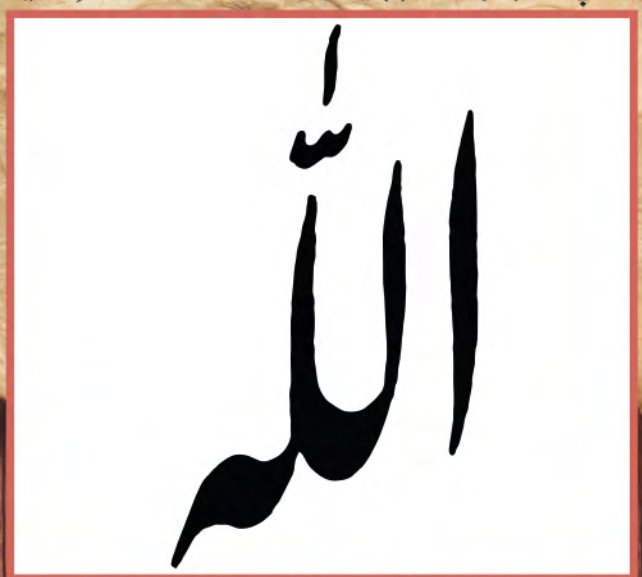

نوٹ: فن پارہ ۳۰، نومبر ۲۰۲۰ء تک ہمیں موصول ہوجانا چاہیے۔ ایک فن پارہ ایک طالب علم کی طرف سے قبول کیا جائے گا۔ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا، جس پر اعتراض قابل قبول نہیں ہوگا۔ مقررہ تاریخ کے بعد وصول ہونے والے فن پارے مقابلے میں شریک نہیں کیے جاسکیں گے۔

بلال دو گھنٹے سے میرے سامنے بیٹھا تھا۔اس کی آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ وہ مجھے تھر، پیاس اور پانی کی روداد سنا رہا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر تھر چلا جاؤں۔ وہ تھر جہاں انسان اور جانور، جوہڑوں میں بارش کا جمع شدہ پانی پینے پر مجبور ہیں۔ بلال جب رخصت ہونے لگا تو مجھ سے کہنے لگا:

''تو بھیا! کب میرے ساتھ تھر چل رہے ہیں؟''

''جیسے ہی فرصت ملی، تمھارے ساتھ تھر چلوں گا۔'' میری بات سن کر وہ فوراً بولا:

''فرصت؟ یہ تو میں ایک عرصے سے سن رہا ہوں، ایک مرتبہ ہمارے ساتھ چلیں تو سہی۔''

''ہاں ضرور، تمھارے ساتھ چلوں گا۔لو میری طرف سے پانچ ہزار روپے، اس کارِخیر کے لیے رکھو۔'' اس نے شکریہ کہہ کر پانچ ہزار روپے جیب میں رکھ لیے۔ وہ جیسے ہی دکان سے باہر نکلا، گھر سے فون آگیا۔امی جان نے بتایا کہ واٹر بورڈ کی طرف سے پانی کی سپلائی کے لیے علاقے کے وال کچھ خرابی ہوگئی ہے، پانی ختم ہوگیا ہے۔امی جان کے فون نے مجھے پریشان کر دیا۔

گرمی کے موسم میں پانی کے بغیر گزارا کیسے ہوگا۔ دکان بند کر کے گھر جاتے ہوئے علاقے کے وال مین سے ملنے کے لیے گیا تو اُس نے بتایا کہ کل دوپہر تک وال کی خرابی دور ہو جائے گی۔علاقے میں پانی ختم ہونے سے تو گویا زندگی رُک سی گئی تھی۔ چھوٹی بہن اور امی جان، خالہ جان کے ہاں جانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ میں بھی ان کے ہم راہ ہولیا۔گرمی کی شدت دن کی طرح رات کے وقت بھی برقرار تھی۔ پنکھے بھی گویا آگ پھینک رہے تھے۔

خبرنامے میں جب تھر کے بارے میں خبر آئی تو میں افسردہ سا ہو گیا۔ میں چھت پر جا کر لیٹ تو گیا تھا، مگر ابھی تک وہ خبر میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

میں نے اسی وقت بلال کو فون کیا۔

''حارث! خیریت تو ہے؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔''

میری بات سن کر بلال نے پوچھا:

''کیا ہوا ہے؟''

''کل میں تمھارے ساتھ تھر چلوں گا۔تم اور تمھاری تنظیم پانی کے حصول کے لیے جو کام کر رہی ہے، اس کا حصہ بنوں گا۔''

پھر اگلے ہی دن امی جان سے اجازت لے کر میں بلال کے ہم راہ تھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ تھر پہنچنے پر گرمی نے

پانی کہانی ۱۵

گلی نمبر سات

نذیر انبالوی۔لاہور

ہمارا اِستقبال کیا۔ جب ہماری گاڑی ایک جھونپڑی کے قریب رُکی تو ایک بوڑھے نے التجا کرتے ہوئے کہا:

''سائیں! پانی کا بندوبست کردو، پیاس سے سب کا حال خراب ہے۔''

''ہاں ہاں، ہم اسی کام کے لیے آئے ہیں۔ ہماری ٹیم کنویں کھودے گی، میٹھا پانی سب کو ملے گا، ان شاءاللہ!'' بلال نے بتایا تو بوڑھے کی اداس آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔

پھر بلال مجھے دائیں طرف لے گیا۔ مزدور کنواں کھودنے میں مصروف تھے۔ جب پہلا کنواں کھودا جا چکا تو تھر کے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ کنواں تیار ہو چکا ہے۔ جب کنویں سے پانی نکالا گیا تو میٹھا پانی پی کر وہاں موجود لوگوں کے چہروں پر رونق آ گئی۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ تھر کے لوگ بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ ایک بزرگ نے بلال کو گلے لگاتے ہوئے کہا:

''اللہ سائیں! تمھیں اور تمھاری ٹیم کو اَجر دے گا، سب لوگ تمھارے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔''

''بس ہمیں دعاؤں ہی کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم اب اور بہت سے کنویں کھودیں گے، سب کو پانی میسر ہوگا، ان شاءاللہ تعالیٰ!''

جب ہم تھر سے واپس آ رہے تھے تو بلال نے بتایا کہ ''ایک کنویں پر تقریباً ایک سے ڈیڑھ لاکھ روپیا خرچ ہوتا ہے۔ مخیر حضرات دل کھول کر اِس نیک کام میں حصہ ڈال رہے ہیں۔ نیک اولاد اپنے مرحوم والدین کے نام پر کنویں بنوا رہی ہے۔ میں ایک نیک عورت کو نہیں بھول سکتا۔''

''کون سی عورت؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ عورت جس نے اپنی سونے کی چھے چوڑیاں اُتار کر عطیہ کی تھیں۔ بڑی مارکیٹ پر چندہ اکٹھا کرنے کے لیے ہماری ٹیم کے لوگ موجود تھے۔ وہاں تھر کے حوالے سے ایک رپورٹ سُن کر وہاں موجود سبھی لوگ آب دیدہ ہو گئے تھے۔ ایک عورت نے اپنی چھے چوڑیاں اُتار کر ہمارے کارکن کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ 'ان چوڑیوں سے جتنے کنویں بن سکتے ہیں بنوا دیجیے'۔'' بلال نے میرے سوال کا جواب دیا۔

.....☆.....

استاد رحمو اَڈّے پر موجود تھا۔ اس کے سامنے ایک رجسٹر رکھا ہوا تھا۔ اس نے رجسٹر پر ایک نگاہ ڈال کر بھولے کو گھورا۔ اس سے قبل کہ بھولا کچھ کہتا، استاد رحمو نے غصیلے انداز میں پوچھا:

''آمدنی کم کیوں ہوتی جا رہی ہے؟''

''استاد جی! کچھ لوگ ہمارا ساتھ دینے پر تیار نہیں ہیں۔'' بھولو کی بات سن کر اُستاد رحمو چلّایا:

''کون ہیں وہ لوگ؟ میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔''

''استاد جی! اگلی نمبر سات میں علاقے کا جو وال ہے، اس کا وال مین پورا وقت اسے کھولے رکھتا ہے۔ وہاں ہر گھر میں پانی دست یاب ہے۔ جب سب گھروں میں پانی ہوگا تو پھر بھلا ہم سے کون پانی خریدے گا۔'' بھولا بولتا چلا گیا۔

شام کے وقت استاد رحمو، سات نمبر گلی کے وال مین شرافت کے سامنے کھڑا تھا۔ استاد نے اپنا تعارف کروایا تو شرافت نے نہایت ادب سے پوچھا:

''جی فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ، اگر شرافت سے نہیں سمجھو گے تو مجھے سمجھانا آتا ہے۔'' استاد رحمو چیخا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں!'' شرافت کی بات سن کر اُستاد رحمو نے اپنا مدعا بیان کیا تو شرافت نے کہا:

''اس کا مطلب ہے، میں آپ کے ساتھ مل جاؤں، ایسا نہیں ہوگا، میں یہ بُرا کام نہیں کروں گا۔''

''تم خود اپنے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہو، سیدھی طرح مان جاؤ، ورنہ پچھتاؤ گے۔ وہ تمھارا منّا شایان آئیڈیل اسکول ہی میں پڑھتا ہے نا! بڑا پیارا بچہ ہے۔ تمھیں اس سے یقیناً بہت پیار ہوگا۔'' استاد رحمو نے شرافت کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

شرافت کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ شایان کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

''تم شایان کو کچھ نہیں کہو گے۔''

''ٹھیک ہے، ایسا ہی ہوگا، مگر تمھیں ہماری بات ماننی.....''

''میں تمھاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔'' شرافت نے استاد رحمو کو بات بھی مکمل نہ کرنے دی۔

''اچھا تو تم یوں نہیں مانو گے۔ ٹھیک ہے، تمھاری مرضی۔'' یہ کہہ کر اُستاد رحمو وہاں سے چلا گیا۔

اگلے دن شرافت اپنے محکمے کے سربراہ عبداللہ کے سامنے موجود تھا۔ عبداللہ نے نہایت اطمینان سے شرافت کی بات سن کر کہا:

بقیہ صفحہ نمبر 82 پر

شکر پارے

قارئین

☆ نوکر مالک سے: ''جناب! میری تنخواہ بڑھا دیں ورنہ......''
مالک (غصے سے): ''ورنہ کیا!؟''
نوکر (مسکین صورت بنا کر): ''ورنہ میں اسی تنخواہ پر گزارا کرلوں گا۔''
(حافظ ابوہریرہ کرنالوی۔ کراچی)

☆ ایک آدمی سیڑھی پر کھڑا ہو کر گھڑی کے اوپر لگا بلب نکال رہا تھا کہ اس سے کسی نے پوچھا:
''بلب نکال رہے ہو؟'' وہ آدمی غصے میں تھا، بولا:
''نہیں، آنکھیں خراب ہیں۔ یہاں سے گھڑی میں ٹائم دیکھ رہا ہوں۔''
(محمد احمد خان۔ کراچی)

☆ شقران اپنے بھائی غفران سے:
''تمھیں نہ لکھنا آتا ہے نہ پڑھنا، آخر تمھیں آتا کیا ہے؟''
غفران: مجھے صرف پسینا آتا ہے۔''
(علشبہ، اسوہ۔ جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، ٹنڈو آدم)

☆ ایک دوست دوسرے سے:
''اگر دنیا میں پانی ختم ہو جائے تو؟
دوسرا دوست: ''دودھ خالص ملے گا۔''
(علشبہ، عفیفہ۔ جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، ٹنڈو آدم)

☆ ایک گاہک دکان دار کے پاس گیا اور بولا:
''چینی ہے؟''
دکان دار: ''ہاں، وہ دیکھو، سامنے بوری رکھی ہوئی ہے۔''
گاہک: ''لیکن اس پر تو نمک لکھا ہوا ہے۔''
دکان دار: ''وہ تو میں چیونٹیوں کو دُور رکھنے کے لیے لکھا ہے۔''

☆ ایک دوست (دوسرے سے):
''کولڈ ڈرنک میں فائدہ ہے یا نقصان؟''
دوسرا دوست: ''کوئی پلائے تو فائدہ اور کسی کو پلائیں تو نقصان۔''
(علشبہ، حفصہ، انیقہ۔ ٹنڈو آدم)

☆ ایک دن ملا نصیر الدین کے محلے میں ایک درزی آیا اور بہت سے لوگوں سے کپڑے لیے۔ صبح ہوتے ہی درزی نے اپنا سامان باندھا اور چلا گیا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا تو بہت پریشان ہوئے اور افسوس کرنے لگے۔
اتنے میں ملا بھی گھر سے زار و قطار روتے ہوئے نکل آئے۔
لوگوں نے پوچھا: ''کیا آپ کا کپڑا بھی لے گیا ہے؟'' ملا نے کہا:
''نہیں، بل کہ وہ میرا ناپ لے گیا ہے۔''
(سیف الرحمٰن۔ بنوں)

☆ فقیر: ''صاحب! میری مدد کیجیے۔ میرا سامان، بال بچے، مکان، روپیا پیسا سب جل گئے۔''
صاحب: ''مگر اِس کا ثبوت کیا ہے؟''
فقیر: ''جناب! ثبوت بھی تھا، مگر مکان کے ساتھ وہ بھی جل گیا۔''
(محمد خبیب اسلم۔ رحیم یار خان)

☆ تین بے وقوف آپس میں بحث کر رہے تھے۔
پہلا: ''ہمارے ملک میں کھدائی ہوئی تو زمین سے ٹیلیفون کے تار برآمد ہوئے اور یہ کوئی ۳۰۰ سال پرانے تھے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ٹیلیفون ہماری ایجاد ہے۔''
دوسرے بے وقوف نے کہا کہ ہمارے ہاں سے ۵۰۰ سال پُرانے تار نکلے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ ہماری ایجاد ہے۔
اب تیسرے بے وقوف نے کہا:
''ہمارے ہاں میں بھی کھدائی ہوئی تھی، لیکن کوئی تار نہیں نکلا۔'' دونوں بے وقوف ہنس پڑے، مگر تیسرے نے بات جاری رکھی اور بات پوری کرتے ہوئے کہا:
''اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمارے آباؤ اجداد وائرلیس فون اور موبائل استعمال کرتے تھے۔
(اریبہ بنت عبداللہ۔ امریکا)

☆ ایک شخص (ڈاکٹر سے): ''ڈاکٹر صاحب! مجھے ساری ساری رات نیند نہیں آتی۔''
ڈاکٹر: ''رات کو بستر پر لیٹ کر ۱۰۰۰ تک گنتی گننا، نیند آجائے گی۔''
اگلے دن ڈاکٹر نے پوچھا: ''جی میرے نسخے پر عمل کیا؟''
پاگل: ''جی ڈاکٹر صاحب! عمل کیا۔ بہت مشکل کام تھا۔ ۵۰۰ تک گنتی ہوئی تو سو گیا، پھر جلدی سے اٹھا، منہ دھویا اور باقی ۵۰۰ گنتی پوری کیا۔''
(محمد فیصل راجپوت۔ جرمنی)

کاش...! آپ جلدی آجاتے!

مفتی محمد معاویہ اسماعیل۔ مخدوم پور

چند دن پہلے ایک دوست کے ہاں جانا ہوا تو باتوں ہی باتوں میں انھوں نے اپنے ایک دوست کی کارگزاری سنائی، جسے سن کر مجھے بہت حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی اور وہ کارگزاری ایمان میں اضافے کا سبب بھی بنی۔ سوچا، ایسی ایمان افروز کارگزاری سے ہر ایک کو مستفید ہونا چاہیے، لہٰذا حاضر ہے انھی کی زبانی۔

''ہماری جماعت کی تشکیل ایک سال کے لیے جاپان ہوگئی۔

ایک روز ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو دعوت دے رہے تھے کہ وہاں ایک عورت بھی آنکلی اور دعوت سننے لگی۔

ہم نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے بارے میں بتلایا کہ وہی ہمیں رزق دیتا ہے۔ اسی ذات نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ زندگی اور موت کا وہی مالک ہے۔ ہر چیز پر قادر ہے۔ عزت ذلت اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

پہلے تو وہ ہماری باتیں بہت ہی غور سے سنتی رہی۔ آخر اُس نے کہا: 'دیکھیں، آپ کی باتیں مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ اب آپ میری بھی چند باتیں سن لیں۔ میں آپ کو بتادوں کہ میں ایک اسکول ٹیچر ہوں۔ کافی عرصے سے سیتا رام نامی بت کی پوجا کر رہی ہوں۔ اسی کو اپنا بھگوان اور خدا مانتی ہوں۔ اگر آپ سچے ہیں، آپ کا دین ہی دین برحق ہے، آپ کا خدا ہی برحق اور وحدہٗ لاشریک ہے اور اُس کے علاوہ باقی سب جھوٹے اور باطل معبود ہیں تو پھر میں اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر میری ایک شرط ہے۔ اگر میری وہ شرط پوری ہوجائے تو مجھے اسلام قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ نہیں تو پھر ویری ویری سوری!'

'کیا شرط ہے؟' ہم نے پوچھا تو وہ کہنے لگی:

'دس سال پہلے میرا ایک بیٹا گم ہوگیا تھا اور آج تک اس کا کوئی پتا نہیں چلا۔ میں نے ہر جگہ اسے ڈھونڈ لیا ہے، مگر اُس کا کوئی اتا پتا ہی نہیں۔ اب تو میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر بھی تھک چکی ہوں۔ اگر تم، تمھارا خدا اور مذہبِ اسلام سچا ہے تو آج رات میرا بیٹا واپس آجائے۔ اگر وہ واپس آگیا تو میں مسلمان ہوجاؤں گی۔'

اس کی یہ عجیب وغریب شرط سن کر ہم حیران بھی ہوئے اور پریشان بھی۔ بہرحال، ہم نے ہمت نہ ہاری اور اُسے سمجھاتے رہے کہ ''میم! اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ آپ کے بیٹے کو جس وقت چاہے واپس لاسکتا ہے، مگر ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی شرطیں لگانا صحیح نہیں۔ خدا تو بے نیاز ہے، اُسے کسی کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں اس کی اور اُس کی رضا کی ضرورت ہے۔'

لیکن ہمارے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی وہ خاتون بضد ہی رہی:

'نہیں، میرا بیٹا واپس آئے گا تو میں اسلام قبول کروں گی، ورنہ نہیں۔' آخر تھک ہار کر ہم نے اسے کہا:

'چلیں، ایسا کریں، پہلے اس سیتا رام بت کو ہٹائیں، جس کی آپ پوجا کرتی ہیں۔ اس کے بعد آج کی رات اللہ تعالیٰ سے دل کے یقین کے ساتھ دعا مانگیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو آپ کا بیٹا واپس آجائے گا۔' ہم نے سمجھا بجھا کر کسی حد

تک اُسے مطمئن کر دیا۔ اس رات ہم سب ساتھیوں نے بھی مل کر اللہ تعالیٰ سے اس خاتون کی ہدایت کے لیے دعائیں مانگیں۔

اگلے دن ابھی ہم اشراق پڑھ رہے تھے کہ وہ خاتون آ گئی۔ اس نے اپنے ساتھ ہم سب ساتھیوں کے لیے اپنے علاقے کا روایتی پُرتکلف ناشتا لیا ہوا تھا اور بہت ہی خوش لگ رہی تھی۔ ہم پھر فکرمند ہو گئے کہ اب اسے کیسے سمجھائیں گے؟ مگر اُس نے آتے ہی ہم سب کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ 'آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر میں نے سیتا رام کے بت کو اُسی وقت اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیا اور دِل لگا کر اللہ تعالیٰ سے مانگا۔ کیا بتاؤں تمھیں! مجھے تمھارے رب سے مانگنے میں اتنا مزہ آیا اور اِتنا قلبی سکون ملا کہ اس سے پہلے اتنا سکون کسی اور جگہ سے کبھی نہیں ملا۔ اسی پُرکیف کیفیت میں رات گزرتی گئی اور مجھے پتا ہی نہ چلا۔ میں مانگنے میں اتنی مدہوش تھی کہ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ احساس تب ہوا جب ڈور بیل بجی۔ میں نے وقت دیکھا، رات کے تقریباً چار بج رہے تھے۔ میں نے دروازے کے ہول سے جھانکا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا۔ میں سمجھی کہ شاید میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں۔ میں نے کیا دیکھا کہ میرا وہی بیٹا جو دس سال پہلے گم ہو گیا تھا، دروازے پر کھڑا تھا۔ مجھے تو یقین ہی نہ ہوا کہ اتنی جلدی میری دعا قبول ہو گئی ہے۔ مجھے لگا کہ شاید میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں نے جلدی سے آنکھوں کو مسلا، پھر اپنی آنکھیں گیٹ کے ہول پر گاڑ دیں، مگر وہ تو واقعی میرا بیٹا ہی تھا، میرا لختِ جگر تھا، جس کی راہیں تکتے ہوئے مجھے تقریباً دس سال ہو گئے تھے، جس کے غم میں رُو رُو کر میری بینائی کم زور ہو گئی تھی، جس کی جدائی میں رونے سے میری آنکھوں کے آنسو بھی ختم ہو گئے تھے۔ میں نے دیوانہ وار دروازہ کھولا اور بیٹے کو اپنے سینے سے لگا لیا، پھر میں ہر چیز کو بھول کر اُس کی خدمت میں لگ گئی۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ ابھی میں اسے سلا کر آئی ہوں، شام کو آپ کو بھی ملواؤں گی۔'

اس خاتون کی یہ باتیں سن کر ہم نے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری بات کی لاج رکھ لی، ورنہ وہ تو بے نیاز ذات ہے۔ ہم نے اس خاتون کا اِکرام قبول کر لیا اور اُسے پھر اسلام کی دعوت دی کہ 'اب آپ کو ضرور اسلام قبول کر لینا چاہیے۔ اب تو آپ کو یقین ہو گیا کہ اسلام ہی دین حق ہے اور اِسی پر چلنے میں ہی دنیا اور آخرت کی کام یابی ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی معبودِ برحق ہیں، ان کے علاوہ باقی سب جھوٹ ہے۔'

'مگر میری ایک اور شرط بھی ہے۔ اگر وہ بھی پوری ہو گئی تو میں ضرور اِسلام قبول کر لوں گی۔'

'اب اور کیا شرط ہے آپ کی؟ یوں شرطیں لگا کر اِسلام قبول کرنے کا کہنا مناسب نہیں ہے۔' ہم نے کہا، مگر وہ اپنی بات پر ڈٹی رہی۔

'اگر وہ شرط پوری ہو جائے تو پھر میں ضرور مسلمان ہو جاؤں گی۔'

'اچھا بتائیں، وہ کیا شرط ہے؟'

'میں کافی عرصے سے بیمار ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ مجھے بالکل ٹھیک کر دے، میں تن درست ہو جاؤں۔ میری آنکھوں کی بینائی بھی مکمل طور پر ٹھیک ہو جائے اور اُس کے علاوہ میری تمام بیماریاں بھی ختم ہو جائیں تو میں ضرور اِسلام قبول کر لوں گی۔''

ہم نے اسے پھر یہی کہا کہ آپ خود اللہ تعالیٰ سے دعا کریں، اللہ تعالیٰ خیر فرمائیں گے۔ وہ خاتون چلی گئی۔ ہم سب ساتھیوں نے بھی اس خاتون کی ہدایت کے لیے پھر تقریباً ساری رات اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں۔

اگلے دن وہ پھر اشراق کے وقت آئی۔ حسبِ معمول ناشتا بھی لائی اور بہت ہی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ کہنے لگی:

'میں نے آج رات پھر دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے بالکل ٹھیک کر دیا ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں۔ میری بینائی بھی بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔ مجھے چشمے کے بغیر بھی بالکل ٹھیک نظر آ رہا ہے۔' وہ بچوں کی طرح خوش دکھائی دے رہی تھی۔

'اور ہاں، ایک بات اور آپ کو بتا دوں، آج میں کل سے بھی زیادہ خوش ہوں۔ پتا ہے کیوں؟ اس وجہ سے نہیں کہ میرا بیٹا آ گیا یا میری بیماریاں اللہ تعالیٰ نے ختم کر دی ہیں، بل کہ اس وجہ سے خوش ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے راہِ حق سُجھا دی ہے۔ مجھے جہنم کے راستے سے ہٹا کر جنت کے راستے پر چلنے کی توفیق مرحمت فرما دی ہے۔ اگر تم نہ آتے تو پتا نہیں میرا کیا بنتا۔ میں یقیناً جہنم کا ایندھن بن جاتی۔' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بہہ پڑیں۔

''لیکن کاش! آپ تھوڑا اَور جلدی آ جاتے۔ کچھ عرصے پہلے مل جاتے تو میری ماں جو میرے ہی بیٹے کے غم میں کافی عرصے بیمار رہ کر کفر پر ہی مر گئی، وہ کفر پر نہ مرتی، وہ جہنم کا ایندھن نہ بنتی۔'' ہم نے اسے تسلی دی۔ آخر کچھ دیر بعد اُسے صبر آ ہی گیا۔

'اب مجھے جلدی سے مسلمان کر دیں۔'

ہم نے اس خاتون کو کلمہ پڑھایا اور باقاعدہ نماز سکھلائی۔ وہ کہنے لگی:

'ایک بات ہے کہ ابھی میں اپنا اسلام ظاہر نہیں کر سکتی اور نہ ہی کروں گی، نہیں تو میرے لیے ایسے مسائل کھڑے ہو جائیں گے جنھیں میں

بقیہ صفحہ نمبر 87 پر

...گویا

زاہدہ عروج تاج۔ بہاول پور

''بھائی! میں تین دن پہلے آپ سے یہ سوٹ پیس لے کر گئی تھی، گھر جا کر کپڑا کھولا تو کپڑے میں جگہ جگہ کھچاؤ ہے۔'' ماجد نے کپڑا خاتون سے لیا اور تہ کھول کر بغور جائزہ لینے لگا۔ کپڑے کی بناوٹ میں واقعی کھچاؤ تھا۔

''آپ کے پاس رسید ہے خریداری کی؟'' ماجد نے کپڑے کو ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بھائی! رسید تو میں نے سنبھال کر نہیں رکھی تھی، میرے ذہن میں ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی کہ مجھے یہ واپس بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔'' خاتون پریشانی سے بولیں۔

''چلیں خیر، مجھے یاد ہے، آپ یہ کپڑا مجھ سے ہی لے کر گئی تھیں۔ میں آپ کو رفیق صاحب سے پیسے واپس دلوا دیتا ہوں۔'' ماجد نے کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلتے ہوئے کہا۔

''رکیں بھائی! ارادہ تو میرا پیسے واپس لینے کا ہی تھا، مگر چوں کہ آپ بلا حیل و حجت کپڑا واپس لے رہے ہیں تو مجھے اسی قیمت میں اور کپڑے دکھا دیں، اب میں یہیں سے خریداری کروں گی۔'' خاتون نے ماجد کی دیانت داری سے متاثر ہوتے ہوئے کہا اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ ایک کی جگہ تین کپڑے لے کر جا رہی تھیں۔

''ماجد میاں! ذرا بات سنیے گا۔'' خاتون کے جاتے ہی رفیق صاحب، جو کہ دکان کے مالک تھے، نے ماجد کو بلا لیا۔

''جی جناب!'' ماجد الگے ہی لمحے ان کے سامنے تھا۔

''یہ آپ نے کیا حرکت کی گویا؟'' رفیق صاحب نے ماجد کے قریب آتے ہی بلا توقف غصے سے پوچھا۔ غصے کی حالت میں ''گویا'' ان کا تکیہ کلام بن جاتا تھا گویا۔

''کون سی حرکت جناب!؟'' ماجد نے کچھ حیرانی اور پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا، گویا اپنی حرکت ڈھونڈنا چاہتا ہو۔

''کپڑا تو آپ نے ان سے یوں واپس لیا جیسے وہ خاتون آپ کی رشتے دار ہوں گویا۔'' رفیق صاحب نے پوچھا۔

''نہیں جناب! میں تو اُنھیں جانتا تک نہیں۔'' ماجد، رفیق صاحب کے اندازِ تفتیش پر بوکھلا سا گیا۔

''تو پھر کپڑا چپ چاپ واپس کر لینے کی وجہ؟ جب کہ ہم ہزار بار کہہ چکے ہیں کہ خریدا ہوا مال واپس نہ لیا جائے۔'' انھوں نے ماجد کو بُری طرح گھورتے ہوئے پوچھا۔

''کپڑے میں نقص تھا جناب!'' ماجد نے چار لفظوں میں صفائی دی۔

''یہ چیز خاتون کو کپڑا خریدتے وقت دیکھنی چاہیے تھی۔ گویا کپڑا اُنھوں نے خود پسند کیا تھا، ہم نے انھیں خریدنے پر مجبور نہیں کیا تھا گویا۔'' رفیق صاحب نے اسے دکان داری کے اصول بتائے۔

''لیکن جناب! اس میں کوئی ہرج بھی نہیں، ہم تو کمپنی سے تبدیل کر سکتے ہیں، کپڑا واپس بھیجیں گے تو وہ ہمیں اس کے بدلے نیا کپڑا بھیج ہی دیں گے گویا۔'' ماجد ''گویا، گویا'' کی گردان سن کر گویا ہوا۔

''ہمیں یہ باتیں سکھانے پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ سمجھے! یہ کوئی چند منٹ کی بات نہیں ہوتی، جیسے وہ خاتون چند منٹوں میں کپڑا واپس کر کے اور خرید کر چلتی بنیں۔ کمپنی کو کپڑا واپس کرنے کی صورت میں ہفتوں لگ جاتے ہیں اور ہمارا پیسا ایک جگہ رکا رہتا ہے گویا، لہٰذا بس جو مال بک گیا سو بک گیا۔'' رفیق صاحب نے ماجد کو اپنے اصول بتائے۔

''مگر جناب! دکان دار کے حسن اخلاق ہی سے پکے گاہک بنتے ہیں۔'' ماجد میاں ڈرتے ڈرتے منمنائے۔

''یعنی کہ ہم جو اتنی دیر سے آپ کے ساتھ مغز کھپا رہے ہیں وہ بھینس کے آگے بین بجا رہے ہیں گویا۔'' رفیق صاحب چیں بجبیں ہوئے۔

''نہیں نہیں، ہرگز نہیں جناب! نہ تو میں بھینس ہوں اور نہ آپ بین بجاتے نظر آ رہے ہیں۔'' سیدھے سادے ماجد میاں نے ان کی مثال کو اصل معنی میں سمجھ کر پُرزور انداز میں سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

''افففففف!'' رفیق صاحب نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''او بدھو میاں! یہ پڑھ لیجیے اگر میری فارسی سمجھ میں نہیں آ رہی تو.....'' انھوں نے اپنے پیچھے لگی تختی پر ہاتھ مار کر کہا، جس پر بڑے بڑے حروف میں ''خریدی ہوئی چیز واپس نہیں ہوگی'' لکھا تھا۔ ماجد میاں نے پہلے تو اُن کے اردو کو فارسی کہنے پر اُن کی دماغی حالت پر شک کی نگاہ سے انھیں دیکھا اور پھر بولا:

''مگر جناب! آپ بھی اردو ہی بول رہے ہیں اور مجھے سمجھ بھی آ رہی ہے۔''

''ارے، یہ پڑھ لے، تو بس یہ پڑھ لے اور پلو سے باندھ لے، مگر تیرا تو پلو بھی نہیں ہے گویا۔'' رفیق صاحب اردو معلّٰی سے دست بردار ہو کر پھٹ پڑے گویا۔

''سمجھ گیا جناب! سمجھ گیا۔'' ماجد میاں یہ کہہ کر نظریں جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

شکر رررر میرے خدایا!'' رفیق صاحب لال منہ کے ساتھ کرسی پر گرتے ہوئے بولے۔

''اب کیا تشریف کا ٹوکرا میرے سر پر رکھیں گے۔ جائیں میاں! دہی بنا دیا ہمارے دماغ کا گویا۔'' ماجد میاں سیدھے اور کچھ زیادہ ہی سادے تھے۔ تشریف کے ٹوکرے اور دماغ کے دہی بارے میں ذہن میں آئے کئی سوال دبائے، جائیں میاں کا اشارہ سمجھ کر اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔

ماجد میاں ویسے تو ہر لحاظ سے بہت اچھے سیلز مین تھے۔ رفیق میاں ان پر اَندھا اعتماد کرتے تھے۔ کبھی ایک پیسے کا ہیر پھیر بھی ان کی طرف سے نہیں پکڑا گیا تھا۔ رفیق صاحب کو اگر کبھی شہر سے باہر جانا پڑتا تو وہ اپنے پیچھے ماجد میاں کی حاضری یقینی بناتے کہ ان کے نہ ہونے کی صورت میں ماجد میاں دکان پر ضرور موجود ہوں۔ ان کی ایمان داری پر کوئی شک نہیں تھا، مگر بعض اوقات ماجد میاں کچھ ایسا کر جاتے کہ رفیق صاحب کو لگتا ماجد میاں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ نہیں، بل کہ گاہک کے ساتھ ہیں اور وہی وقت ہوتا کہ وہ سوچتے، ایک لمحے سے پہلے انھیں دکان سے نکال باہر کریں، جیسا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ماجد میاں کے ساتھ مغز ماری کرتے ہوئے ان کا دل چاہ رہا تھا۔

''بھائی صاحب! وہ سبز والا کپڑا دکھائیے گا۔'' ماجد میاں ابھی تک ڈانٹ ہضم نہ کر پائے تھے، تقریباً ساڑھے سات کا وقت ہوگا، وہ لوگ دکان بند کرنے کے لیے مال رکھ کر رہے تھے کہ ایک محترمہ تیزی سے دکان میں داخل ہوئیں اور کپڑوں کو بغور دیکھتے ہوئے اسی سبز کپڑے کو دیکھنے کی فرمائش کی۔

ماجد میاں نے پہلے تو الماری میں موجود باقی سب سبز رنگ کے کپڑوں پر ہاتھ رکھا، مگر جب محترمہ کسی طرح نہ ٹلیں اور وہی سبز کپڑا دیکھنے کی فرمائش کی تو بالآخر اُنھیں وہ کپڑا نکالتے ہی بنی۔ محترمہ نے سرسری طور پر کپڑا دیکھا اور ''مجھے بالکل یہی رنگ چاہیے تھا، بیٹی کو ٹیبلو میں اسی رنگ کا سوٹ چاہیے۔'' کہتے ہوئے کپڑا پسند کیا اور چہکتے ہوئے قیمت پوچھی۔ ماجد میاں نے تھوک نگلتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھا اور محترمہ کو کپڑے کے نقص بارے بتایا، کیوں کہ سرسری دیکھنے میں کھچاؤ پتا نہیں چل رہا تھا۔

''بہتر ہوگا کہ آپ کپڑا کھول کر اچھی طرح دیکھ لیں۔'' ماجد میاں نے آہستہ سے کہا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ بظاہر اَخبار پڑھتے رفیق صاحب نہ صرف پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھے، بل کہ کانوں کے اینٹینے بھی اسی طرف لگائے ہوئے تھے۔

''ایسا کریں کہ اس کے ساتھ ایک میٹر زائد کپڑا بھی دے دیں۔'' محترمہ تو سبز کپڑا دیکھ کر ایسے باغ باغ ہو رہی تھیں کہ ماجد میاں کی دبی دبی درخواست ان کے کان اور سر کے اوپر سے گزر گئی اور وہ اس کپڑے کے ساتھ مزید ایک میٹر کپڑا لینا چاہ رہی تھیں۔

''باجی! کپڑا ابھی غور سے دیکھ لیں، ہمارے ہاں خریدا ہوا کپڑا واپس نہیں ہوتا، ہاں!'' ماجد میاں نے اب کے ذرا اُونچی آواز میں کہا اور ساتھ ہی ترچھی نظروں سے رفیق صاحب کی طرف بھی دیکھا جو کہ ان ہی کی طرف متوجہ تھے۔ ماجد میاں نے بلاسبب دانت نکالے اور منہ دوسری طرف کر کے تھوک نگلا۔

''بھیا! جب میں کہہ رہی ہوں کہ یہی رنگ ہے جو مجھے چاہیے تھا تو آپ بس دے دیں۔'' محترمہ نے روٹھے پن سے کہا اور ماجد میاں بوکھلا کر کپڑا ماپنے لگے۔ دوسری طرف رفیق صاحب ان کی اس حرکت پر بھناتے ہوئے سوچ رہے تھے، ماجد میاں کو گاہکوں سے بہت ہمدردی ہے اور اُن کی یہ ہمدردی، ہماری سردردی نہ بن جائے۔ اب کچھ سنجیدگی سے ان کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔ نہ جانے ہماری غیر موجودگی میں اور کتنے گاہک بھگا دیتے ہوں گے۔''

.....☆.....

''آہا رفیق صاحب! آج کیسے ہمارے نصیب جاگ گئے۔'' سیٹھ عابد نے رفیق صاحب کو اپنی دکان میں داخل ہوتے دیکھا تو اُن کے استقبال کے لیے آگے بڑھ کر بولے۔

''بس آپ کی یاد آئی تو آ گئے جناب! اور سنائیں کیا حال ہے آپ کا، کام کاج کیسا جا رہا ہے؟'' سلام دعا کے بعد رفیق صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

''یار عابد! مجھے تجربہ کار اور با اعتماد سیل مین چاہیے، کوئی ہے نظر میں؟'' باتوں باتوں میں رفیق صاحب کو آنے کا اصل مقصد یاد آیا تو بولے۔

''یار تمھارے پاس ماجد ہے، اس سے بڑھ کر با اعتماد اور کون ہوگا؟'' سیٹھ عابد نے حیرت سے کہا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ وہ نہ صرف دوسرے لڑکوں پر نظر رکھے، بل کہ نئے لڑکوں کو کام بھی سکھا دے۔''

''تو اِس کام کے لیے بھی ماجد میاں نہایت موزوں ہیں میرے خیال سے۔''

''مگر ماجد میاں سے ہم یہ کام نہیں لے سکیں گے۔''

''ہائیں، مگر وہ کیوں؟'' سیٹھ عابد حیران ہوئے۔

''دراصل ماجد میاں کو آج ہی ہم فارغ کر چکے ہیں۔''

''ہائیں! لیکن کیوں میاں!؟'' سیٹھ عابد حیرت سے چلائے اور رفیق صاحب بغیر رُکے ماجد میاں کے کارنامے سناتے چلے گئے۔ آخر رفیق صاحب کے چپ ہونے پر سیٹھ عابد پہلے مسکرائے اور پھر ہنس پڑے۔ رفیق صاحب نے حیرت سے انھیں دیکھا تو وہ بولے:

''میرے بھائی کیا آپ کو پتا ہے کہ ماجد کی صورت میں آپ کو کیسا سلیم الفطرت شخص ملا ہے، اس کفرانِ نعمت کا سوچیں بھی مت۔'' سیٹھ عابد چوں کہ رفیق صاحب سے بڑے تھے، اس لیے سمجھانے کے انداز میں بولے۔

''سلیم الفطرت! وہ کیسے؟'' رفیق صاحب چونکے۔

''وہ ایسے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے ہمیں تجارت کے جو اُصول بتائے ہیں، وہ بغیر علم کے بھی ماجد کی فطرت میں ہیں۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً مفہومِ حدیث ہے کہ اگر تاجر سچ بولے اور گاہک پر مال کی حقیقت واضح کر دے تو اُس کے سودے میں برکت ہوگی اور اگر عیب چھپایا اور جھوٹ بول کر مال بیچا تو برکت اٹھالی جائے گی۔'' سیٹھ ماجد کے یہ کہنے پر ایک لمحے کو رفیق صاحب کی آنکھیں پوری کھلیں اور وہ بولے:

''ہاں، یہ بات تو ہے۔ جب سے ماجد میاں آئے ہیں دکان کی سیل بڑھ گئی ہے، حالاں کہ ان کی حرکتوں سے مجھے لگتا ہے کہ گیا گاہک اب واپس نہیں آئے گا۔''

''اور سنو، فرمایا: ''بہترین مومن وہ ہے جو قرض، خرید و فروخت اور تقاضا کرتے ہوئے نرمی کرتا ہے،'' اور دُعا دی ہے اس شخص کو کہ ''اللہ ایسے شخص پر رحم فرمائے۔'' سیٹھ صاحب چپ ہوئے تو رفیق صاحب نے توبہ توبہ کے انداز میں کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''چلیں، اچھا ہے۔ ہم تو کب سے یہ دعا کر رہے تھے کہ ماجد میاں جیسا بندہ ہمیں بھی مل جائے اور آپ جو دل چاہے میرا سیلز مین لے جائیں، ماجد میاں کو ہم لے آتے ہیں۔'' سیٹھ صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

''نہ بھیا نا! اب ہم ایسا گھاٹے کا سودا کیوں کرنے لگے۔ آپ نے ہماری آنکھیں کھول دیں، بہت شکریہ، بل کہ میں تو اَب اسی مہینے سے ماجد میاں کی تنخواہ بڑھا کر واپس لاتا ہوں، تاکہ کام سے جواب ملنے پر جو اُن کا دل بُرا ہوا اُس کا کچھ ازالہ ہو جائے۔'' رفیق صاحب نے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا، جیسے اگر وہ فوراً نہیں گئے تو ماجد میاں انھیں نہیں ملیں گے۔ رفیق صاحب کی بوکھلاہٹ دیکھ کر سیٹھ عابد ہنس پڑے۔

''اور دیکھیں، اللہ کیسے اپنے معصوم اور نیک بندوں کے کام سنوارتا ہے۔'' سیٹھ عابد بلند آواز سے بولے اور مسکرا دیے۔

بچو! اس کا نام بتانا ۵

جماعت اول تک کے بچے اس پہیلی کو بوجھ کر اس کا درست جواب ارسال کریں۔ بذریعہ قرعہ اندازی درست جوابات بھیجنے والوں میں سے تین پیارے بچوں کے گھر والوں کو انعام دیا جائے گا۔ جواب ۳۰، نومبر ۲۰۲۰ء تک ہمیں موصول ہوجانا چاہیے۔

ٹکر مارے

ریحان طائر۔ کراچی

گھاس اور پتّے کھاتا ہے وہ
سب بچّوں کو بھاتا ہے وہ

روز گلی میں چکّر مارے
رسّی توڑے ، ٹکّر مارے

عید پہ وہ گھر گھر آتا ہے
ہر دل میں گھر کر جاتا ہے

''میں میں'' کر کے شور مچائے
اچھلے کودے ، باز نہ آئے

بچّو! اُس کا نام بتانا
کیا کہتا ہے اُس کو زمانہ

''جناب! سلیم قریشی بھائی آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔'' چوکی دار ملازم حسین نے باہر سے آکر مجھے بتایا۔

''ہوں، ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں آتا ہوں۔'' میرے ماتھے پر ہلکی ہلکی شکنیں اُبھر آئی تھیں۔

''اللہ جانے کیوں تشریف لائے ہیں یہ صاحب! ہوگی کسی چیز کی ضرورت۔ ہاں بھلا، اور کس لیے آسکتا ہو وہ یہاں۔'' میں ناگواری سے سوچتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

''السلام علیکم جی!'' سلیم قریشی مجھے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ سلیم قریشی میرا ہمسایہ ہے۔ ریڑھی پر سبزی فروخت کرتا ہے۔ غریب آدمی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہی اس نے اپنی دو بیٹیوں کی شادی کی تاریخ طے کی تھی، لہٰذا اُسے پیسے مانگنے کے علاوہ اور کیا کام ہوسکتا تھا ان دنوں مجھ سے، اور پھر اُس کے بات شروع کرتے ہی میرا اندازہ سو فی صد درست ثابت ہوا۔ حال احوال پوچھتے ہی اس نے کہنا شروع کیا:

''جناب! بچیوں کی شادی کے سلسلے میں مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے بطورِ قرض۔ بہت احسان مند ہوں گا آپ کا اور ان شاء اللہ بہت جلد لوٹانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' سلیم قریشی کے لہجے میں التجا کے ساتھ رقم واپس کرنے کا پکا عزم بھی تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ میرے جواب کا بے قراری سے انتظار کرنے لگا۔

میں نے سوچا، بچیوں کی شادی کرنے کے بعد تو اچھے اچھے دیوالیے ہوتے دیکھے ہیں۔ یہ غریب سبزی فروش بھلا کہاں میری رقم واپس کرنے کے قابل ہو سکے گا۔

میں اگرچہ امیر ترین آدمی ہوں۔ دولت کی ریل پیل ہے۔ کسی شے کی کمی نہیں ہے، مگر اپنی دولت یوں دوسروں پر لگانے کا کوئی شوق میں نے آج تک نہیں پالا، سو کچھ دیر سوچ کر میں نے اسے انکار کر دیا اور انکار کر کے میں نے کوئی غلطی بھی نہیں کی۔ دولت میری ہے، میری محنت کی کمائی تھی اور اُس پر مجھے مکمل اختیار حاصل ہے کہ میں کسی کو دوں یا نہ دوں۔ ملازم حسین میرے ساتھ کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔

میرے انکار کرنے پر سلیم قریشی کی آنکھوں میں مایوسی کے سائے لہرانے لگے۔ امید کی وہ شمع جو کچھ دیر پہلے تک اس کی آنکھوں میں روشن دکھائی دے رہی تھی، یک دم ہی بجھ گئی۔ وہ بغیر کچھ بولے واپس چلا گیا۔

ایک شام ملازم حسین نے کسی ضروری کام کے تحت مجھ سے کچھ دیر کی رخصت چاہی۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور کچھ دیر کے بعد عشا کی نماز کے لیے مسجد کی طرف چل پڑا۔

نماز ادا کر کے میں واپس آرہا تھا۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ چاند کی روشنی کی وجہ سے راستہ آسانی سے نظر آرہا تھا، مگر واپسی پر میں نے دیکھا، سلیم قریشی کے دروازے پر کوئی شخص کھڑا اُس سے کچھ راز و نیاز کر رہا تھا۔

''میری بیوی بہت کفایت شعار عورت ہے۔ کچھ نہ کچھ بچا کر رکھنے کی پرانی عادت ہے اس کی۔ میں نے اسے آپ کی ضرورت کے بارے میں بتایا تو وہ دوڑ کر اپنی جمع پونجی نکال لائی اور خوشی خوشی کہنے لگی:

'میری جمع کی ہوئی اس رقم کا اس سے بہترین مصرف نہیں کہ اللہ کے کسی بندے کی ضرورت اور پریشانی کے وقت کام آجائے۔ آپ جائیے اور یہ رقم اسے دے کر آئیے۔'

تم جب تک سہولت سے دے سکو دے دینا، پریشان مت ہونا۔'' میں آگے چل پڑا تھا۔ مزید کچھ سننے کی مجھ میں ہمت نہ رہی تھی۔

گلی میں پھیلی نیم روشنی میں، میں ایک فاصلے سے کھڑا ہو کر یہ سب سن رہا تھا، کہنے والے کو دیکھ نہیں رہا تھا، مگر رقم سلیم قریشی کے ہاتھ میں دینے والے شخص کی آواز پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ جی ہاں، رقم اسے دینے والا شخص کوئی اور نہیں، ملازم حسین تھا۔ شکر ہے، دونوں میں سے کسی نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔

صبح سے اب تک مجھے اپنے انکار پر کوئی ملال، کوئی افسوس نہیں تھا، مگر اَب تو میں شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا اور ملازم حسین سے تو نظریں ملانے کی جیسے مجھ میں ہمت ہی نہ رہی تھی۔

کتنا فرق تھا مجھ میں اور اُس غریب چوکی دار میں۔

ایڈونچر

ش۔م۔دانش۔پائی خیل

غراہٹ انتہائی ہلکی تھی، لیکن جنگل میں اتنا زیادہ عرصہ گزارنے کی وجہ سے میرے کان حساس ہو چکے تھے اور میں نے وہ ہلکی سی غراہٹ بھی سن لی تھی، تاہم میں یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ یہ کس جانور کی غراہٹ ہے، کیوں کہ غراہٹ انتہائی ہلکی تھی۔

میری نگاہیں تجسس کی وجہ سے سکڑ گئی تھیں اور میں یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ جانور مجھ سے کتنے فاصلے پر اور کس طرف ہو سکتا ہے۔ تمام بکریاں بھی رک گئی تھیں اور سامنے دیکھ رہی تھیں، البتہ دونوں بیل اپنی مستی میں گم آگے جا رہے تھے۔ بوزو (میرا کتا) بھی رک گیا تھا اور فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا، تاہم وہ بھونک نہیں رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ بھی یہ اندازہ نہیں لگا پایا کہ غراہٹ کس جانور کی تھی۔

میرے خیال میں یہ کوئی بھیڑیا ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے چھڑی دائیں ہاتھ میں پکڑی اور بائیں کندھے سے بندوق اتار لی۔ میں خود تو ایک عام سا چرواہا ہی ہوں، لیکن میرے ابا جان ایک مشہور شکاری تھے اور اُنھوں نے مجھے بھی بندوق چلانا سکھا دیا تھا، کیوں کہ جنگل میں رہنے کی وجہ سے کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ بعد میں مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو گیا، کیوں کہ میں بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ اکثر جنگل کے اندرونی حصے میں چلا جاتا تھا، وہاں سے واپسی پر کئی چھوٹے جانوروں سے مڈبھیڑ ہو جاتی تھی اور اِس معاملے میں بوزو ہمیشہ میرا مددگار رہا تھا، لیکن آج معمول سے زیادہ دیر ہو گئی تھی۔

اگر میرا خیال درست تھا تو میں اس وقت بہت زیادہ خطرے میں تھا، کیوں کہ بھیڑیا اکیلا نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ جھنڈ کی صورت میں حملہ آور ہوتا ہے اور یہی بات میرے لیے خطرناک تھی، کیوں کہ میں اس وقت اکیلا بھی تھا اور اپنی پناہ گاہ سے کافی دور بھی۔

غراہٹ ایک مرتبہ پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ غراہٹ واضح تھی۔ یہ کوئی بھیڑیا ہی تھا، میرا بھیانک خیال درست ثابت ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے جھنڈ کے دوسرے بھیڑیے کہیں قریب ہی ہوں گے۔

میں اس غراہٹ سے بھی یہ اندازہ نہ لگا پایا کہ بھیڑیا کس طرف ہے؟ البتہ بوزو غراہٹ سن کر دائیں طرف جھپٹا۔ میں نے بھی بندوق کا رُخ جلدی سے دائیں طرف کیا اور گولی چلانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت میرے بائیں طرف آہٹ ہوئی۔ میں جلدی سے بائیں طرف گھوما، لیکن.....

مجھے دیر ہو چکی تھی، ایک بڑے قد کا بھیڑیا مجھ پر حملہ کر چکا تھا۔ میں اوندھے منہ گرا اور بندوق میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ بھیڑیے شاید دو تھے۔ وہ عجیب چال چلے تھے۔ بھیڑیا میرے اوپر آ گرا، لیکن عین اسی لمحے کسی انجانی طاقت نے اسے میرے اوپر سے کھینچ لیا۔

بھیڑیے کے اوپر سے ہٹتے ہی میں نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن اسی لمحے دائیں طرف والا بھیڑیا مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ اس دوران میں، میں یہ دیکھ چکا تھا کہ پہلے بھیڑیے کو بوزو ٹانگ سے پکڑ کر پیچھے کھینچ رہا

تھا۔ اب مجھے اس انجانی طاقت کا ادراک ہوا جس نے بھیڑیے کو میرے اوپر سے کھینچا تھا، وہ بوزو تھا۔

میں نے بھیڑیے کو اپنے اوپر سے اچھالنا چاہا، لیکن وہ میرے جسم سے کسی جونک کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دونوں پنجوں سے میرے سر کو پکڑا اور اپنے نوکیلے دانت میرے نرخرے میں گاڑ کر اُسے ادھیڑنا چاہا، لیکن میں نے فوراً کروٹ بدل لی اور اُس کے نوکیلے دانت میری گردن کے بجائے میرے دائیں کندھے میں اتر گئے۔ اب بھیڑیا نیچے اور میں اوپر تھا۔ میرے ضبط کرنے کے باوجود میرے منہ سے سسکاری نکل گئی۔ میرے کندھے سے خون بہہ رہا تھا، لیکن اگر اُس وقت میں خون کی پروا کرنے بیٹھ جاتا تو میری لاش کو شاید قبر بھی نصیب نہ ہوتی، اس لیے میں نے زخم کی پروا کیے بغیر پورے زور سے ایک مکا بھیڑیے کی گردن پر مارا۔ اس وقت میری شدید خواہش تھی کہ کاش! میں محمد علی کلے ہوتا یا کم از کم میرے ہاتھوں پر لوہے کے دستانے ہوتے، کیوں کہ میرے مکے نے بھیڑیے کا تو کچھ نہیں بگاڑا تھا، البتہ میرا ہاتھ ٹوٹ کر رہ گیا تھا، شاید ایک آدھ ہڈی بھی ٹوٹ ہوگئی ہو، لیکن میں نے اس طرف توجہ نہ دی۔

اب میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف توجہ مرکوز کی اور یہ دیکھ کر مجھے ہلکی سی مسرت ہوئی کہ میرے دائیں ہاتھ میں اب تک چھڑی دبی ہوئی تھی، گو یہ کوئی اتنی مضبوط چھڑی نہیں تھی، لیکن پھر بھی اس وقت میرے لیے ایک تنکے کی طرح سہارا تھی۔ میں نے اس تنکے کا سہارا لینا ضروری سمجھا۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ گھمانے میں پوری طاقت صرف کر ڈالی۔ یہی وجہ تھی کہ چھڑی پوری قوت سے بھیڑیے کے منہ پر پڑی اور بھیڑیا بُری طرح غرا کر رہ گیا۔ اپنا وار کام یاب ہوتا دیکھ کر میں نے ایک بار پھر چھڑی پوری قوت سے گھمائی اور اِس بار وہ بھیڑیے کے منہ کے بجائے اس کے کندھے پر جا لگی، اگلا لمحہ میرے لیے نہایت ہی خطرناک تھا، کیوں کہ چھڑی تڑاخ کی آواز سے درمیان سے ٹوٹ گئی اور میں حسرت سے اپنے ہاتھ میں موجود چھڑی کے آدھے ٹکڑے کو دیکھتا رہ گیا۔ بھیڑیے نے میری غفلت کے اس موقع سے کوئی فائدہ اٹھانا ضروری نہ سمجھا، کیوں کہ وہ مجھے ایک کمزور شکار ہی سمجھ رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے میں نے اپنی بندوق کی طرف چھلانگ لگائی، لیکن اگلے ہی لمحے میرے سینے پر بھیڑیے کا ہلکا سا پنجہ پڑا اور میں الٹ کر وہیں جا گرا۔ گو بھیڑیے نے اپنی طرف سے مجھے ہلکا سا دھکا ہی دیا تھا، لیکن مجھے اپنا سانس سینے میں گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے میرا سانس سینے میں اٹک گیا ہو۔ بھیڑیے کو ایک بار پھر اپنی طرف آتے دیکھ کر میں نے پوری قوت سے سینے میں اٹکا سانس باہر کی طرف دھکیلا اور اپنی بندوق کی طرف ایک بار پھر چھلانگ لگا دی۔ اس بار میں بندوق تک پہنچنے میں کام یاب ہو گیا تھا اور اُسے نال سے پکڑ بھی لیا تھا، لیکن بندوق ہاتھ میں لے کر اُٹھنے کی حسرت میرے دل ہی میں کہیں دفن ہو کر رہ گئی، کیوں کہ بھیڑیے نے ایک بار پھر حملہ کر دیا تھا۔

میں پشت کے بل گرا، لیکن میں نے اپنے ہاتھوں کی گرفت بندوق کی نال پر مضبوط کر لی، کیوں کہ صرف اسی کی بدولت میں کام یاب ہو سکتا تھا۔

بھیڑیے نے اپنے دانت میری گردن میں گاڑنے چاہے، لیکن میں نے بندوق آگے کر دی اور اُس کے دانت بندوق کے دستے میں گھستے چلے گئے۔ میں نے جلدی سے بندوق اس کے دانتوں سے کھینچی اور اُس کی گردن پر پوری قوت سے جمانا چاہی، لیکن بندوق کا دستہ گردن پر لگنے سے پہلے ہی بھیڑیا پیچھے ہٹ چکا تھا۔

میں اپنے زور میں گھومتا چلا گیا۔ بندوق میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک بار پھر دُور جا گری۔ بھیڑیا شاید اِسی لمحے کا منتظر تھا، اس نے ایک بار پھر مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں پر اُسے روکنا چاہا، لیکن وہ کم بخت، بل کہ خوش بخت بہت زیادہ طاقت وَر نکلا، کیوں کہ کم بخت تو اِس وقت میں تھا۔

میرے دونوں ہاتھ اس کے ایک جھٹکے سے ہی بے کار ہو گئے اور پھر اُس نے اپنے دانت میرے نرخرے میں گاڑ دینے چاہے، لیکن میں نے پوری طاقت استعمال کرتے ہوئے کروٹ لی اور اُس کے دانت میری گردن میں اترنے کے بجائے میرے کندھے میں اترتے چلے گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دائیں کندھے میں انگارے بھر گئے ہوں۔ درد بہت شدید تھا، اس لیے ضبط کی کوشش کے باوجود میرے منہ سے چیخ نکل ہی گئی۔

مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ بھیڑیے نے مجھ پر حملہ کرنے کی جرأت کیسے کر لی، کیوں کہ عام طور پر بھیڑیا انسان پر حملہ کرنے سے کتراتا ہے۔ ہاں، وہ بکریوں پر ضرور حملہ کر سکتا تھا، کیوں کہ بکریاں اس کی مرغوب غذا ہونے کے ساتھ ساتھ کمزور شکار بھی ہوتی ہیں۔

اب ایسی صورت میں، جب کہ میرے ساتھ ہی بکریاں اور گائے بھی تھیں، قاعدے کی رُو سے انھیں مجھ پر حملہ کرنے کے بجائے بکریوں پر حملہ کرنا چاہیے تھا، لیکن انھوں نے بکریوں کو چھوڑ کر مجھ پر حملہ کیا تھا، جس کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ وہ اس سے پہلے انسانی خون چکھ چکے ہیں، کیوں کہ جس درندے کے منہ کو اِنسانی خون کا چسکا لگ جائے، پھر اُسے کسی اور

جانور کا خون پسند نہیں آتا۔

اگر یہ بات تھی تو بہت ہی خطرناک صورتِ حال تھی کیوں کہ میرا شکار کرنے کے بعد وہ کسی اور اِنسان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے اور اِس طرح پورا گاؤں ان کی لپیٹ میں آجاتا۔

میں نے اس بھیڑیے سے جان چھڑانے کے لیے ایک بار پھر کوشش شروع کردی، لیکن وہ کم بخت بہت طاقت وَر اور وزنی تھا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح اپنے دانت میری گردن تک پہنچانے میں کام یاب ہوجائے اور میری کوشش یہ تھی کہ میں کسی طرح اس کے نیچے سے نکل جاؤں۔

دوسرا بھیڑیا، کتے سے لپٹا ہوا تھا اور وہ دونوں خون میں لت پت دکھائی دے رہے تھے، شاید دونوں نے ایک دوسرے کو مارنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔

میرا کتا بوزو چوں کہ قد آور تھا، اس لیے وہ بھیڑیے سے کم نہیں پڑ رہا تھا، لیکن بھیڑیا بھی کسی صورت پیچھے نہیں ہٹنا چاہتا تھا۔

بوزو مجھے دوسرے بھیڑیے کے نیچے دبا دیکھ کر میری طرف بڑھنا چاہتا تھا، لیکن بھیڑیا اسے آگے نہیں بڑھنے دے رہا تھا۔ اچانک اس نے بیلوں کی طرف منہ اٹھایا اور بھونکنے لگا۔

بیل چونک کر اُسے دیکھنے لگے اور پھر اچانک ایک بیل ڈکراتے ہوئے اس بھیڑیے پر حملہ آور ہوگیا جس نے مجھے نیچے دبایا ہوا تھا۔

بھیڑیا مجھے چھوڑ کر اُس کی طرف لپکا اور اُچھل اُچھل کر اُس کی گردن پر حملہ کرنے لگا۔ بیل نے غصے میں آکر سر کو جھٹکا تو اُس کے سینگ پورے زور سے بھیڑیے کو لگے اور وہ دور جا گرا۔

میرے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی، میں نے جلدی سے بندوق اٹھائی اور اُس کا نشانہ لے کر فائر کردیا، لیکن.....

قسمت کے کھیل دیکھیے ، ٹوٹی کہاں کمند!
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

عین فائر کے وقت مجھے ایک دھکا لگا اور بندوق میرے ہاتھ سے ایک بار پھر گر گئی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دھکا دینے والے کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر میرا دِل اچھل کر حلق میں آگیا کہ مجھے دھکا دینے والا ایک تیسرا بھیڑیا تھا، جو شاید اَب تک موقع کی تاک میں تھا۔

بندوق کی گولی دھکا لگنے کی وجہ سے نہ جانے کس طرف چلی گئی تھی، البتہ فائر کی آواز سے بھیڑیے کچھ خوف زدہ ہوگئے تھے، لیکن اتنے خوف زدہ بھی نہیں کہ بھاگ ہی جاتے۔

تیسرے بھیڑیے کے دھکے سے میں زمین پر گر گیا اور وہ بھیڑیا میرے اوپر آگرا۔ اب اس کی کوشش تھی کہ اپنے دانت میرے گلے میں اتار دے اور میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا، لیکن اس بار مجھے لگتا تھا کہ

میں زندگی کی بازی ہار جاؤں گا، کیوں کہ میرا دم خم ٹوٹ چکا تھا اور تھکاوٹ حد سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ میرے زخمی بازو سے بھی درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

میں نے آخری امید کے طور پر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، لیکن میری امید دِل ہی دل میں دم توڑ گئی، کیوں کہ دوسرا بھیڑیا کتے پر حاوی ہو چکا تھا اور اُسے تقریباً ختم کر چکا تھا۔ بیل، بکریاں ڈر کر دور بھاگ رہی تھیں اور تیسرا بھیڑیا بڑی بے نیازی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے اپنے تمام جسم کا زور یک جا کر کے آخری بار اُس بھیڑیے کو اُوپر سے گرانے کی کوشش کی کہ اگر میں کام یاب نہ ہوا تو شاید یہ میری آخری کوشش ہی ثابت ہو۔

اور پھر وہی ہوا کہ میں بھیڑیے کو گرانے میں کام یاب نہیں ہو سکا اور میں نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے، کیوں کہ میرے جسم کی ساری توانائی اور طاقت ختم ہو چکی تھی۔

میرے ذہن پر بار بار غنودگی طاری ہو رہی تھی اور اندھیرا بار بار دِماغ پر جھپٹ رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر اندھیروں کو دُور کرنے کی کوشش کی اور عین اسی لمحے بھیڑیے نے مجھے کمزور پڑتا دیکھ کر اپنے دانت میرے نرخرے میں گاڑ دیے۔

میرے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ میری آنکھوں کے آگے تارے سے ناچ رہے تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اب میرا سانس رکنے ہی والا ہے۔

شاید میں نے اس دنیا میں جو گنے چنے دن گزارنے تھے، ان کی گنتی پوری ہو چکی تھی۔ میں نے ایک بار پھر آخری کوشش کے طور پر اپنے دونوں ہاتھ بھیڑیے کی گردن پر رکھے اور.....

اور عین اسی لمحے امی جان نے آواز دی:

''بیٹا! کھانا تیار ہے، جلدی سے کھالو، پھر تمھیں بکریوں کو بھی چرانے لے کر جانا ہے۔''

اور کہانی کے سارے ''کلائمکس'' کا بیڑہ غرق ہو گیا۔

اب آپ ہی بتائیں کہ ایسے وقت میں جب کہانی بالکل عروج پر ہو اور کوئی آپ کو اِس طرح ''ڈسٹرب'' کر دے تو ''ایڈونچر'' کا سارا مزہ کِرکِرا ہو جاتا ہے یا نہیں! میرا کہانی لکھنے کا مزہ بھی کِرکِرا ہو چکا ہے۔

اب میں تو چلا بکریاں چرانے اور آپ بھی تجربہ کر دیکھیں کہ عین کلائمکس پر کہانی روکنی پڑ جائے تو اَیڈونچر کی کیا حالت ہوتی ہے۔

بقیہ: لاحاصل زندگی

مانگنے کا حق نہیں رکھتا تھا۔ اب وہ آزاد تھا۔

اس کے ساتھی کچھ فاصلے پر اُس کے لیے پھولوں کے ہار لیے کھڑے تھے۔ یہ صورتِ حال ان متاثرین کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھی۔ عادل نے چند دن آرام کیا اور اُس کے بعد وہ اپنے چھوٹے شہر سے نکل کر بڑے شہر میں آ گیا، جہاں اس کے لیے رہائش اور ترقی کے کافی مواقع موجود تھے۔ اس نے یہاں عالی شان بنگلا خریدا اور پھر دن بھر اپنی نئی چمکتی گاڑی میں ڈرائیور کے ہم راہ گھوم کر مختلف تعمیراتی منصوبوں کا جائزہ لینے لگا اور اپنی راہ و رسم بڑھا کر کچھ تعمیراتی کاموں میں حصہ دار بن گیا۔

دوسروں سے ہتھیائی ہوئی اربوں روپے کی رقم سے اب وہ ایک شاہانہ زندگی گزارنے لگا۔ اسے اب آمدن کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس کی ضروریات اور فضول خرچی کے بعد اُس کی آمدنی کا زیادہ حصہ بچ جاتا تھا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔

ایک دن جب وہ کسی پروجیکٹ کا جائزہ لینے پہنچا تو اُسے دل کی شدید تکلیف ہوئی۔ ہسپتال جا کر پتا چلا کہ یہ دل کا دورہ تھا جو فوری امداد کے سبب ٹل گیا۔ چند دن بعد وہ صحت مند ہو کر گھر پہنچ گیا۔ تین ماہ بعد اُسے ایک بار پھر دِل کے دورے نے تکلیف میں ڈالا۔ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی جسم سے روح کا رشتہ ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھی ہی اسے ہسپتال لے کر گئے۔ گھر کا کوئی فرد، پرانے شہر کا کوئی باسی اور کوئی دوست اس وقت موجود نہ تھا۔ ان سب سے بڑھ کر اُس کی دولت پر اَب کس نے قبضہ کیا؟ یہ بھی پتا نہ چلا۔ اربوں روپے کہاں گئے؟ اس کا حساب لینے والا اب کوئی نہ تھا۔

اس کا پرانا دوست سلیم اب بھی اس کی خبر رکھے ہوئے تھا۔ گو کہ دونوں میں بات چیت نہ تھی۔ سلیم نے اس کی قبر کو مٹی دی۔ قبرستان میں اس کے چار ساتھیوں کے علاوہ کوئی موجود نہ تھا۔ وہاں بھی وہ اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد اور رقم پر اُلجھتے نظر آئے۔

قبرستان سے نکلتے وقت سلیم کو بے اختیار سورۂ عصر یاد آئی، جس میں اللہ رب العزت نے زمانے کی قسم کھاتے ہوئے بتایا ہے کہ تمام انسان خسارے میں ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو اِیمان لائے اور نیک کام کرتے رہے۔

عادل نے جو رقم غریبوں اور مجبوروں سے ہتھیائی تھی، وہ سب دوسروں کے لیے چھوڑ کر اکیلا ہی اپنے گناہوں کی گٹھڑی اٹھائے قبر کے اندر چلا گیا۔ اگر وہ استاد ہی رہتا تو کئی جگنو اُس کی علم کی روشنی سے چمکتے، مگر اَب اس کی زندگی لاحاصل اختتام پذیر ہو گئی۔

دور نہیں رہ سکتا

کاوش صدیقی۔لاہور

''کرلے گا نا میرا بیٹا!؟'' بابا نے مجھ سے پوچھا۔

''جی میں کرلوں گا!'' میں نے جواب دیا۔

بابا پھلوں کا ٹھیلا لگاتے تھے۔ دن بھر میں اچھے خاصے پھل بک جاتے تھے۔ بڑی سڑک کے ایک تکونے حصے میں ہم لوگ کافی عرصے سے پھلوں کا ٹھیلا لگاتے تھے۔ بڑی سڑک کے اس تکونے حصے کا ایک فائدہ تو یہ تھا کہ یہاں پر لوگ گاڑی روک کے آرام سے پھل خرید سکتے تھے۔ دوسرا یہ کہ ہمارے دائیں جانب بڑے بڑے گھروں اور بنگلوں کی آبادی تھی، جو عموماً روز ہی پھل خریدتے تھے، پھر چلتے پھرتے بہت سے لوگ بھی خریداری کرتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے ہمارا کام بہت اچھا چل رہا تھا۔

بابا نے مجھ سے کہا تھا کہ اسٹیکر لگا دو۔ یہ اسٹیکر ہمیں پھل والے منڈی میں دے دیتے تھے، جو ہم استعمال کرتے تھے۔

اکثر آپ نے سیب، تربوز، خربوزے، آم وغیرہ پر ایک چھوٹا سا رنگین کاغذ چپکا ہوئے دیکھا ہوگا، جس پر پھل کے بڑے بیوپاری اپنا نام چھاپ دیتے ہیں۔ اکثر لوگ یہ اسٹیکر نہ تو پڑھتے ہیں اور نہ ہی دیکھتے ہیں اور یہ اسٹیکر پھل کو دھونے یا کاٹنے میں ضائع ہوجاتا ہے، مگر یہ اسٹیکر بہت کام کا ہوتا ہے۔ جن سیبوں، آم یا خربوزوں وغیرہ میں کوئی داغ، دھبا یا سوراخ ہو، یہ اسٹیکر اُس کے اوپر لگایا جاتا ہے، جس سے پھل کا داغ چھپ جاتا ہے۔ اصل میں زیادہ تر یہ اسٹیکر اسی کام کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

اب آپ ذرا سوچیں.....

چمکتا ہوا لال لال سیب جسے دیکھتے ہی کھانے کو دل للچائے اور آپ کو اچانک اس میں سوراخ یا داغ نظر آئے تو کیا آپ خریدیں گے اور کھائیں گے؟

نہیں، ہرگز نہیں!

مگر اِس داغ یا سوراخ پر ایک چمکتا دمکتا اسٹیکر لگا ہو تو پھر تو آپ کو یہ داغ اور سوراخ نظر نہیں آئے گا اور آپ فوراً خرید لیں گے۔ ہے نا!

اور مجھے ان ہی داغوں اور سوراخوں پر اِسٹیکر لگانے تھے۔

میں اسٹیکر لگا ہی رہا تھا کہ ایک بڑی سی کار آکر رُکی۔ اس کا شیشہ نیچے ہوا اور اُس میں سے ایک صاحب نے آواز دی:

''چاچا جی! یہ سیب کیا حساب ہیں؟''

''ایک سو نوے روپے کلو۔ دیکھیں، کیسے لال لال ہیں!'' بابا نے فوراً آگے بڑھ کر کہا۔

وہ بولے: ''تین کلو سیب دے دو، اور وہ کینو؟''

''کینو اَسی روپے درجن ہیں، آپ کو مزہ آجائے گا۔'' بابا نے فوراً کہا۔

''لے جائیں چار پانچ درجن۔ بچوں کے گھر میں تو پتا ہی نہیں چلتا۔''

''ہاں، یہ تو ہے!'' کار والے صاحب بولے۔ ''چار درجن دے دیں!''

بابا نے جلدی سے سیب تولے اور مجھے ایک شاپر پکڑایا اور کہا: ''اس میں گن کر اَڑتالیس کینو ڈال دو۔''

میں نے گن کر اَڑتالیس کینو شاپر میں ڈالے۔ بابا نے میرے ہاتھ سے شاپر لیا اور بولے: ''صاحب! یہ دو کینو مزید ڈال رہا ہوں اپنی طرف سے بچوں کے لیے۔''

''اچھا شکریہ۔'' وہ صاحب ہنسے اور بٹن دبا کر کار کی ڈگی کھول دی۔

میں نے دونوں شاپر ڈگی میں رکھ کر ڈگی بند کر دی۔ ان صاحب نے

پیسے دیے اور گاڑی آگے بڑھادی۔

میں نے پوچھا: ''بابا آپ نے دو کینوز زیادہ دے دیے، کیا آپ کے خیال میں، میں نے گنتی صحیح نہیں کی تھی؟''

بابا نے کہا: ''نہیں، گنتی تو تم ٹھیک کرتے ہو، لیکن جب گاہک ہماری مرضی کے پیسے دے رہا ہو اور نرخ پر بحث نہ کرے اور ہمیں اچھی بچت بھی ہو رہی ہو تو دو ایک دانے زیادہ دینے سے گاہک خوش ہو جاتے ہیں اور پھر دوسری مرتبہ بھی ہمارے پاس ہی آتے ہیں۔'' بابا نے مجھے سمجھایا۔

''جی۔'' میں نے کہا اور اِسٹیکر لگانے لگا۔

کچھ دنوں میں آم کا موسم آ گیا اور ہم آم سجانے لگے۔ پیلے پیلے سلیقے سے لگے ہوئے آم دور ہی سے گاہک کو کہتے: ''آؤ، آؤ، ہمیں لے جاؤ۔''

اور لوگ مزے سے خریدتے۔

ہم لوگ پھلوں کو کپڑے سے صاف کرتے، جس پر ہلکا سا سرسوں کا تیل لگا ہوتا۔ اس سے پھل اوپر سے صاف اور چمک دار ہو جاتے اور دور ہی سے گاہکوں کو کہتے: ''آیئے، ہمیں کھایئے۔''

آموں کے ساتھ ساتھ ہی تربوزوں کا موسم آ گیا۔ ہم ایک ٹرک تربوز آرام سے ہفتے بھر میں بیچ لیتے تھے۔

تربوز کے بارے میں بھی لوگ بابا پر بھروسا کرتے تھے۔

لوگ پوچھتے: ''چاچا جی! یہ میٹھا ہے نا!؟''

''میٹھا!'' بابا سوچتے، پھر ایک تربوز اُٹھاتے، تھپتھپاتے اور رکھ دیتے، پھر دوسرا، تیسرا اُٹھاتے، تھپتھپاتے اور کہتے: ''نہیں، بھئی نہیں۔'' پھر وہ پانچواں تربوز اُٹھاتے، تھپتھپاتے اور کہتے: ''ہاں یہ لیں، مل گیا۔''

یہ تربوز وزن میں چار کلو سے کم نہ ہوتا۔

گاہک خوشی خوشی لے جاتا۔

بعض گاہک کہتے۔ میٹھا ہوگا، پکی بات ہے نا!''

بابا کہتے: ''ابھی چیک کرواتا ہوں!'' وہ چھری سے فوراً ایک چھوٹا سے چوکور ٹکڑا کاٹ کر گاہک کو دیتے۔ ''یہ لیں، چیک کر لیں۔''

''واقعی! یہ تو میٹھا ہے۔'' گاہک فوراً چکھتے ہوئے سر ہلاتا۔ ''یہ تول دیں۔''

اب آپ کو راز کی بات بتاؤں۔ بابا جس پانی میں چھری صاف کرتے وہ پانی سِکرین ملا ہوتا، جو چھری میں لگ کر تربوز کو میٹھا کر دیتا۔

ہاں تو ہمارا کام بہت اچھا چل رہا تھا۔

کئی بار ہمارے رشتے داروں نے کہا: ''ٹھیلے سے اتنا کما رہے ہو۔ گرمی سردی ہوتی ہے، دکان لے لو۔''

بابا کہتے: ''نا بھائی نا! میں دکان نہیں لوں گا۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''بابا! آپ دکان لینا کیوں نہیں چاہتے؟''

''یار! کون دکان کھولے، کرایہ دے، ٹیکس دے۔ بس ٹھیلا ہی صحیح ہے، نہ ٹیکس کا چکر نہ گاہک کی تُو تُو میں میں؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا دکان سے گاہک ناراض ہو جائیں گے؟''

''نہیں یار!'' بابا نے مجھے سمجھایا۔ ''ٹھیلے والے کو لوگ محنتی سمجھتے ہیں کہ دیکھو بے چارہ گرمی، سردی، بارش میں ٹھیلا لے کر کھڑا ہے۔ چلو، پھل بھی خرید لیں گے اور مدد بھی ہو جائے گی۔'' بابا نے بتایا۔ ''جب کہ لوگ دکان دار کو مزے سے بیٹھ کر منافع کمانے والا سمجھتے ہیں۔''

مجھے بہت حیرت ہوئی، مگر میں چپ رہا۔ میرے بابا بہت سمجھ دار تھے۔

جمعے کے دن ہماری بکری بہت ہوتی تھی، کیوں کہ جامع مسجد ہم سے تھوڑی ہی دور تھی اور لوگ جب نماز کے بعد باہر نکلتے تو پھل ضرور خریدتے۔

بابا خود تو نماز نہیں پڑھتے تھے، مگر مجھے نماز کے لیے ضرور بھیجتے تھے۔

مسجد کے مولانا صاحب بہت میٹھے انداز میں دین کی باتیں بتاتے تھے۔ ان کی باتیں بہت آسان ہوتی تھیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ بہت عام سی باتیں بتاتے تھے، جنھیں سن کر حیرت ہوتی تھی کہ اچھا! اس طرح سے ہمیں اپنے پیارے نبی ﷺ کی سنت کے مطابق چلنا چاہیے!

مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے کہا: ''دیکھیے بھائیو! مسلمان کا ہر عمل عبادت بن سکتا ہے ایک ذرا سی توجہ سے!''

ان کی یہ بات سن کر مجھ سمیت بہت سے لوگ انھیں حیرت سے دیکھنے لگے۔

انھوں نے کہا: ''کھانا کون نہیں کھاتا۔ ہم سب کھاتے ہیں! کیوں کہ کھائے بغیر ہم رہ نہیں سکتے۔''

''جی ہاں، جی ہاں!'' سب نے تائید کی۔

مولانا صاحب بولے: ''ہاں تو عبادت شروع، کیسے؟ میں سمجھاتا ہوں۔ کھانے آیا، گرما گرم، بھاپ اڑاتا ہوا۔ سالن ہے، چاول ہیں، روٹی ہے، سلاد ہے، ٹھنڈا پانی ہے اور لو جی، ہم نے بسم اللہ پڑھی اور کھانا

شروع کر دیا۔''

''مگر اَبھی یہ عبادت نہیں، صرف کھانا ہے۔''

مولانا صاحب ذرا رُکے۔ لوگوں کی طرف دیکھا، سب ان کی طرف ہی متوجہ تھے۔ وہ دوبارہ بولے:

''ہاں تو بسم اللہ پڑھی، نوالہ اٹھایا، مگر ٹھہریئے۔ ہمیں صرف کھانا نہیں کھانا، عبادت کرنی ہے، لہٰذا اب ہم یہ نیت کریں: 'یا اللہ پاک! مہربان! عطا کرنے والے! یہ لذیذ مزے دار کھانا جو تُو نے ہمیں عطا کیا، ہم اس کھانے کو اِس نیت سے کھا رہے ہیں کہ یہ ہضم ہو کر ہمیں طاقت اور قوت عطا کرے اور ہم اس طاقت سے پنج وقتہ نماز پڑھیں، تلاوتِ قرآن کریں، خرید و فروخت کریں اور دوسرے بھلائی کے کام کریں۔' لو جی، اب یہ کھانا، اس کا لقمہ لقمہ، ذرہ ذرہ، دانہ دانہ، سب بابرکت بھی ہو گیا اور عبادت بھی ہو گیا۔''

''ماشاءاللہ! سبحان اللہ!''

میں حیران رہ گیا۔ واقعی یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ کیا عبادت ایسے بھی ہو سکتی ہے!؟

.....☆.....

جمعے کے دن مسجد خوب بھری ہوئی ہوتی ہے۔ میں بھی جلدی سے وضو کر کے مسجد میں پہنچ گیا۔ مولانا صاحب کہہ رہے تھے:

''دوستو! آج ہم تجارت کے متعلق بات کریں گے۔ اپنے مال کو اِیمان داری سے، پورا وزن کر کے فروخت کرنا، مال کے عیب بتا کر دینا، یہ سنت ہے۔

ہمارے پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تجارت کرتے تھے اور اپنے مال کی حالت سے گاہک کو آگاہ فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی سچائی اور ایمان داری کے باعث لوگ ہمیشہ آپ ﷺ سے خریداری کرتے تھے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، جامع ترمذی میں ہے کہ ''سچا اور امانت دار تاجر، قیامت میں انبیا، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہوگا۔''

مولانا صاحب کے یہ جملے میرے دماغ میں بیٹھ گئے۔ میں نماز کے بعد واپس آیا تو گاہکوں کی ایک بھیڑ ٹھیلے کے گرد جمع تھی اور بابا کافی پھرتی سے پھل تول تول کر گاہکوں کو تھما رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر بابا خوش ہو گئے۔ انھوں نے کہا: ''آجاؤ بیٹا! جلدی سے شاپر میں آم ڈال دو۔''

میں آم نکالنے لگا۔

آدھا پونا گھنٹا اسی میں نکل گیا۔ گاہک چلے گئے اور رَش ختم ہو گیا۔

بابا نے کہا: ''اب ذرا جلدی سے اسٹیکر لگا دو۔''

''اچھا۔'' میں اسٹیکر لے کر سوچ میں پڑ گیا۔

بابا نے مجھے دیکھا تو بولے: ''کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کچھ تو ہے۔'' بابا نے مسکرا کر پوچھا اور کُرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔

میں نے پوچھا: ''بابا ہمارے نبی ﷺ نے ہمیشہ سچ کہا ہے نا!؟''

''ہاں۔'' بابا نے جلدی سے کہا۔ ''اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ کافر بھی آپ ﷺ کی سچائی کی گواہی دیتے تھے۔''

''تو پھر؟'' میں نے انھیں دیکھا۔

''تو پھر کیا!؟'' بابا نے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''بات کیا ہے؟''

میں نے کہا: ''آج مولوی صاحب نے بتایا ہے کہ سچا اور اَمانت دار تاجر انبیا، صدیقین اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔''

''ہاں، مولانا صاحب بھی جھوٹ نہیں بولتے۔'' بابا نے کہا۔

''تو پھر بابا! قیامت کے دن جب ہمارے پیارے نبی ﷺ کھڑے ہوں گے۔ ان کے ساتھ ان کے خلفا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کھڑے ہوں گے۔ شہیدانِ جنگ بدر اور اُحد بھی ہوں گے، دوسرے شہدا اور ایمان دار تاجر بھی کھڑے ہوں گے تو کیا ہم بھی ان کے ساتھ کھڑے ہوں گے؟''

بابا نے مجھے حیرت سے دیکھا: ''کیا مطلب! تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

میں نے کہا: ''بابا! ہمیں تو اُن کے پاس نہیں جانے دیا جائے گا۔''

''کیوں نہیں جانے دیا جائے گا؟'' بابا نے غصے سے کہا۔ ''کیا ہم سارا دن خرید و فروخت نہیں کرتے، دھوپ میں کھڑے نہیں ہوتے!''

''ہاں بابا!'' میں نے کہا۔ ''مگر؟''

''مگر کیا!؟'' بابا نے تیزی سے پوچھا۔

''بابا ہم تجارت کرتے ہیں، مگر سچے اور ایمان دار نہیں ہیں۔ ہم اسٹیکر لگا کر سوراخ اور دھبے چھپا دیتے ہیں۔ رنگ والی لپچیاں بیچتے ہیں۔ سکرین والے خربوزے بیچتے تھے۔ ہم اپنے نبی ﷺ کے ساتھ کھڑے نہیں ہو سکتے۔ ہمیں ہمارے نبی ﷺ سے علاحدہ کر دیا جائے گا۔'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بقیہ صفحہ نمبر 51 پر

سوال کہانی

ایک شخص ہیروں کا مالک تھا۔ ایک دن اس نے سوچا کہ کیوں نا ہیرے بادشاہ کو تحفے کے طور پر پیش کیے جائیں، چناں چہ ایک روز وہ ایک تھیلے میں کچھ ہیرے رکھ کر بادشاہ کے محل جا پہنچا۔ بادشاہ تک پہنچنے کے لیے سات دروازوں سے گزرنا پڑتا تھا اور ہر دروازے کے باہر ایک دربان کھڑا تھا۔ جب ہیروں والا شخص پہلے دربان کے پاس پہنچا تو دربان نے کہا:

''میں تمھیں اس وقت گزرنے دوں گا جب تم اپنے آدھے ہیرے مجھے دو گے۔''

ہیرے والے شخص نے کہا:

''ٹھیک ہے، لیکن تمھیں ایک ہیرا مجھے واپس کرنا ہوگا۔'' دربان نے اُس کی بات مان لی۔ اس شخص نے اپنے تھیلے میں سے آدھے ہیرے نکال لیے اور دربان کو دے دیے۔ دربان نے اُن میں سے ایک ہیرا اُس شخص کو واپس کر دیا۔

اب جب وہ شخص باقی دربانوں کے پاس سے گزرا تو اُن سب نے یہی شرط رکھی اور اُس شخص نے بھی اپنی شرط دہرائی اور اِس طرح سب دربانوں کو آدھے ہیرے دیتا اور ایک ہیرا واپس لیتا وہ بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔ جب وہ بادشاہ کے پاس پہنچا تو اُس آدمی کے پاس دو ہیرے اب بھی باقی تھے۔

اب آپ یہ بتائیے کہ جب وہ شخص گھر سے چلا تھا تو اُس کے پاس کتنے ہیرے تھے؟

راجا صاحب

ضیاء اللہ محسن۔
ساہیوال

اُس شرارتی ٹولے کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب راجا صاحب ہاتھوں میں مولا بخش لیے ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ خبردار ہوتے، ڈنڈے ان کی کمر پر برسنا شروع ہو گئے۔ عاطف، ذیشان، مانی اور ججو اِس افتاد سے گھبرا کر کلاس روم کی طرف بھاگے۔ نہم کلاس، جہاں پہلے ہی شور شرابے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی، اب ان چاروں کی آمد سے شور میں مزید اضافہ ہو گیا۔

اسلامیات کے استاد شفیق صاحب آج چھٹی پر تھے۔ موقع غنیمت دیکھ کر ججو نے باہر میدان میں فٹ بال کھیلنے کی تجویز دی تو ذیشان، مانی اور عاطف لبیک کہتے ہوئے اس کے ساتھ ہو لیے۔ ویسے بھی آخری دورانیہ تھا۔ کلاس میں بیٹھ کر گپیں ہانکنے یا خیالی پلاؤ پکانے سے بہتر تھا کہ فارغ پڑی فٹ بال کی خیر خبر لی جائے، مگر یہ کیا؟ اچانک پی ٹی ماسٹر راجا صاحب اپنا مولا بخش لہراتے اُدھر آ نکلے۔ اپنے منصوبے کو ملیامیٹ ہوتے دیکھ کر چاروں کے منہ پر بارہ بج گئے، بل کہ الٹا انھیں اب جان کے لالے پڑ گئے۔

''اٹن شن..... دائیں مڑ..... سیدھے چل..... لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ۔''

راجا صاحب کی گرج دار آواز گونجی تو چاروں نے کلاس روم کی جانب دوڑ لگا دی۔

''ہونہہ! آج اس بڈھے کا اسکول میں آخری دن ہے، لیکن مجال ہے جو اس موقع پر بھی ہماری جان چھوڑ دے۔'' مانی بدتمیزی سے بڑبڑایا۔

''ان کا تو بس غصہ اور ڈنڈا ہی چلتا ہے ہر وقت، راجا صاحب بھی نا!''

ذیشان نے اپنے غصے کا اظہار کیا۔

''بھئی، یہ بوڑھا ریٹائرمنٹ کے تین سال بعد نہ جانے کیوں ہمارے اسکول میں گھس آیا؟ شاید گھر والے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔'' مانی نے دوبارہ بدتمیزی کی تو بھاگتے بھاگتے سب کھلکھلا اُٹھے۔

''اوئے چپ کرو! کہیں یہ راجا صاحب اپنی بزرگی کا رُعب اور ڈنڈا لیے ہمارے کمرے میں نہ کود پڑیں۔'' ججو نے سب کو چپ کروانا چاہا۔

''ہاں ہاں، ہر بار خود ہی منصوبے بنا کر ہمیں بھی پھنسا دیا کرو۔ ہونہہ، دیکھ لیں گے راجا صاحب کو بھی۔'' عاطف کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہا تھا۔ ابھی کمرے میں پہنچے انھیں زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اگلے ہی لمحے راجا صاحب اپنا مولا بخش لہراتے غصے سے اندر داخل ہوئے۔

''تم چاروں باہر آ کر مرغا بن جاؤ۔'' انھوں نے غضب ناک انداز میں حکم نامہ جاری کیا تو ججو، مانی، ذیشان اور عاطف ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھنے لگے۔

''وہ..... سر..... اصل میں.....'' ججو نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کچھ کہنا چاہا۔

''خاموش! زبان کھینچ لوں گا تمھاری۔'' سفید ریش راجا صاحب طیش میں آ کر چلّائے۔ ان کا جھریوں بھرا چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

راجا صاحب کے بارے میں سنا ہے، کسی سرکاری اسکول میں پی۔ ٹی۔ ماسٹر تھے۔ ایک عدد مولا بخش اور پرانی ٹوٹی پھوٹی سائیکل ان کی خاص پہچان تھی۔ ساری زندگی محنت اور حق حلال کی کمائی کھائی۔ پیٹ کاٹ کر بچوں کو پالا۔ ایک بیٹا اور چار بیٹیاں تھیں۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اپنی محدود آمدن میں راجا صاحب نے بچوں کی خوراک، تعلیم اور دیگر ضروریات کا خیال رکھا، انھیں ماں کا پیار بھی دیا۔ اس کے باوجود اُن کے لہجے کی گھن گرج خوب تھی۔

''نام کیا ہے تمھارا؟'' راجا صاحب نے پوری جماعت پر

ایک طائرانہ نظر ڈالی، پھر ڈنڈا ججو کی گردن پر رکھتے ہوئے اُس کا نام پوچھا۔

''جج.....ججو.....جی ججو ہے میرا نام۔'' ججو ہکلایا۔

''ججو.....! یہ کیسا نام ہے؟''

''بچپن سے ہی سب اسی نام سے پکارتے ہیں جی، میرے گھر والے بھی۔ ویسے تو عبدالعزیز ہے میرا نام۔'' وہ ڈرتے ڈرتے ہکلایا۔

''کیا کہا: عبدالعزیز!؟ اوہ! مگر.....'' راجا صاحب چونک اٹھے: ''تمھیں پتا ہے کہ یہ کتنا قیمتی نام ہے؟ مگر تمھاری حرکتیں؟ اور خود تم.....؟'' وہ آگے بڑھے اور ججو کا گریبان پکڑ کر آپے سے باہر ہو گئے۔ غصے سے ان کا چہرہ سرخ اور آواز کلاس روم سے باہر جانے لگی۔ اچانک ان کے ہاتھ لرزے اور پھر پورے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ججو کو کچا نگل جائیں گے۔ انھوں نے ہاتھ میں پکڑا مولا بخش بلند کیا، اس سے پہلے کہ وہ ججو کو ضرب لگاتے، ان کے کانپتے لرزتے ہاتھوں سے وہ ڈنڈا زمین پر جا گرا۔ ''جا معاف کیا تجھے!'' اس کے ساتھ ہی وہ ڈیسک کے ساتھ ٹیک لگا کر نڈھال سے ہو گئے۔ ایسا منظر سب طالب علموں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ راجا صاحب کی یہ حالت غیر دیکھی تو مانیٹر نے بھاگ کر اُنھیں تھاما اور کرسی پر بٹھا دیا۔

''ثمر! جلدی سے پانی لاؤ'' مانیٹر ضیا کے کہنے پر ثمر پانی لینے بھاگا۔ اگلے ہی لمحے کلاس نے ایک اور منظر دیکھا۔ بچوں پر رُعب اور دبدبہ جمانے والے راجا صاحب اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیے سسکیاں لے رہے تھے۔

''اوہ! اسکول میں آج ان کا آخری دن ہے، شاید اِس لیے راجا صاحب جذباتی ہو گئے ہیں۔'' ذیشان نے عاطف کے کان میں سرگوشی کی۔

''لیکن نہیں یار! بھلا ایسے!؟'' عاطف کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

پانی پینے کے بعد راجا صاحب نے رومال سے اپنے آنسو صاف کیے اور ججو سمیت سب بچوں کو اِشارے سے بیٹھنے کا حکم دیا۔ ان کا غصہ غائب ہو چکا تھا۔

راجا صاحب کا اصل نام چند اساتذہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس سبھی انھیں راجا صاحب ہی کہتے تھے۔ گزشتہ چھے سال سے وہ اس اسکول میں پی۔ٹی۔ ماسٹر کی ذمے داریاں نبھا رہے تھے۔ لیفٹ رائٹ..... لیفٹ رائٹ..... ان کی مخصوص آواز میں ڈرل کا شن پورے اسکول میں گونج رہے ہوتے۔ وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی سائیکل پر آتے اور روزانہ صبح آٹھ بجے اسمبلی ہال میں موجود ہوتے تھے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد جب آرام کا وقت آیا تو اُن کا جواں سالہ بیٹا ایک روز اپنی دکان سے گھر واپس آتے ہوئے ڈاکوؤں کے ہاتھ چڑھ گیا، گولیاں چلیں اور بے چارا نعمان خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

راجا صاحب کی تو جیسے دنیا ہی لُٹ گئی تھی۔ نعمان سے چھوٹی چاروں بہنوں کے ہاتھ پیلے کرنے اور گھر کا خرچہ چلانے کے لیے راجا صاحب کی پنشن ناکافی تھی۔ سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے انھیں اس پرائیویٹ اسکول میں نوکری کے لیے درخواست جمع کرانا پڑی۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ اسکول کے پرنسپل صاحب ان کے جاننے والے نکل آئے، ان کی سفارش پر اِسکول کے مالک نے انھیں نوکری پر رکھ لیا تھا۔ گزشتہ چھے سال سے وہ اب اسی پرائیویٹ ادارے میں پی۔ٹی۔ ماسٹر تھے۔ ان کی کھڑک دار آواز سے بچوں کے دل سہم جایا کرتے۔

''ڈرل کرتے ہوئے جانا ہے، ڈرل کرتے ہوئے آنا ہے، پاؤں سے پاؤں ملنے چاہییں، بازو ہلا کر چلا کرو۔'' اسکول کی مختلف راہداریوں میں ہر طالب علم کو اُن کی یہ نصیحتیں سننا پڑتیں، لیکن آج تو بچے حیرت کا بت بنے ہوئے تھے۔ اپنی عادت کے مطابق راجا صاحب کا ججو کو دیکھتے ہی اس قدر غصے میں آنا اور پھر سسکیاں بھرنا، کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہے!

''یہ دورانیہ کس کا ہے؟'' کرسی پر بیٹھے راجا صاحب نے اپنا چشمہ اور آنکھیں صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ اب ان کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تھی۔

''سر شفیق صاحب کا ہے، مگر وہ آج آئے نہیں۔'' بچوں نے جواب دیا۔

کلاس میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ طلبہ کی جرأت نہ تھی کہ ان کے آگے بول سکیں۔ راجا صاحب کے چہرے پر چھائی اُداسی اور غم کسی بات کی چغلی کھا رہے تھے۔ ان کی سرخ اور نمناک آنکھیں اس بات کی علامت تھیں کہ اندر ہی اندر وہ اب بھی رو رہے ہیں۔

''بچو! آج میرا اسکول میں آخری دن ہے۔ اب سے چند لمحوں بعد میں آپ لوگوں کو اللہ حافظ کہہ جاؤں گا۔ اگر تمھیں پسند ہو تو ایک کہانی سناؤں؟''

''یس سر! ضرور سنائیں۔'' بہت سے بچے کہانی کا سُن کر پُرجوش ہو گئے، جب کہ کئی ایسے بھی تھے جو راجا صاحب کے چلے جانے پر زیادہ خوش دکھائی دے رہے تھے۔ گویا آج ان کی دعائیں رنگ لا رہی تھیں۔

''یہ قیام پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔'' راجا صاحب نے کہانی شروع کی تو سبھی طالب علم ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''آزادی سے پہلے جالندھر (انڈیا) میں سراج دین نامی ایک کسان

رہتا تھا۔ سیدھا سادہ، بھولا بھولا کسان، اپنی دھن کا پکا اور بہت محنتی تھا۔ شادی کے چار سال بعد اللہ پاک نے سراج دین اور حمیدہ بیگم عرف حمیداں کو ایک چاند سا بیٹا عطا کیا۔ بچے کی پیدائش پر خاندان بھر میں خوشیاں منائی گئیں۔ مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ سراج دین اور حمیداں نے اس کا نام عبدالعزیز رکھا۔'' یہ کہتے ہوئے راجا صاحب نے عبدالعزیز عرف عجو کی طرف دیکھا تو ساری کلاس کہانی کی وجہ جان گئی۔

''عبدالعزیز بہت پیارا بچہ تھا۔ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا۔ گول مٹول سا، نیلی آنکھوں والا، مگر پیدائش کے ایک ہفتے بعد ہی وہ سانس کی بیماری کا شکار ہوگیا۔ علاج معالجے کے لیے بہت جتن کیے گئے، لیکن عبدالعزیز ٹھیک نہ ہوسکا اور آخر کار اللہ کو پیارا ہوگیا۔ اس اچانک موت پر ماں باپ کی تو گویا دنیا ہی لٹ گئی۔ رشتے داروں کو بھی بہت افسوس ہوا، لیکن قدرت کے اس امر پر سب نے صبر کیا۔

چار سال بعد ملنے والی اولادِ نرینہ کو اپنے ہاتھوں دفن کرنا بہت تکلیف دہ منظر تھا، پر اللہ کے حکم کے سامنے سراج دین اور حمیداں کر بھی کیا سکتے تھے؟ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ سو گھر میں چھائی افسردگی کی فضا رفتہ رفتہ چھٹنے لگی۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد اللہ تعالیٰ نے دوبارہ ان کی گود ہری کردی۔ سراج دین کے ہاں ایک اور بچے کی آمد ہوئی۔ اِس بار پھر گھر بھر میں خوشیاں لوٹ آئیں۔ خوشی کے اس موقع پر بچے کا باپ بھاگ کر حلوائی سے لڈو لے آیا۔

''یہ لے بھلی مانس! اللہ نے عبدالعزیز لیا تو ایک اور کھلونا ہمیں عطا کردیا ہے۔ تُو جلدی سے یہ لڈو کھا، میں باقی رشتے داروں کو بھی خبر کرتا ہوں۔ اور ہاں، نام کیا رکھنا ہے بچے کا؟'' اُس نے مسکرا کر حمیداں سے پوچھا۔

''مجھے میرا عبدالعزیز بہت یاد آرہا ہے، اسی لیے ہم اس کا نام بھی عبدالعزیز ہی رکھیں گے۔'' حمیداں نے جواب دیا۔

''اوہ بھئی! اللہ کے بنائے نام تو اور بھی بہت ہیں، مگر چل، تُو کہتی ہے تو یہی رکھ لیتے ہیں، حالاں کہ یہ نام ہم پہلے بھی رکھ چکے ہیں۔'' سراج دین نے رضامندی ظاہر کردی، چناں چہ اس دوسرے بچے کا نام بھی عبدالعزیز رکھ دیا گیا۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ دس بارہ روز بعد یہ بچہ بھی انتقال کر گیا۔ یار لوگوں نے بہت باتیں بنائیں۔ رشتے داروں نے طعنے دیے کہ ایک مردہ بچے کے نام پر دوسرے بچے کا نام رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ بس اسی چیز کا سایہ پڑ گیا ہے۔ یہ سنتے ہی سراج دین بے چارا بہت پریشان ہوا اور خود کو ملامت کرنے لگا۔

شوہر کی اس خاموشی کو حمیداں نے بھی بھانپ لیا، مگر وہ چپ رہی۔ دو بچوں کی جدائی کسی بھی ماں باپ کے لیے بہت بڑا صدمہ ہوتی ہے۔ اس سانحے کے بعد حمیداں بھی اکثر چپ رہنے لگی تھی۔ کبھی اکیلی ہوتی تو آنکھیں بھر لاتی۔ سراج دین بے چارا اُسے بہت تسلیاں دیتا۔ رفتہ رفتہ دن گزرنے لگے۔ دو سال کیسے گزر گئے، ذرا بھی محسوس نہ ہوا۔ اللہ نے ایک بار پھر اُن کی سن لی اور ایک چاند سے بیٹے سے نوازا تو گھر بھر میں خوشیوں کا سماں بندھ گیا۔

اب کی بار سراج دین کو اَندازہ تھا کہ اس کی بیوی بھی اپنی پرانی ''غلطی'' پر توبہ کر چکی ہوگی، چناں چہ اس ننھے منے بچے کو گود میں اٹھایا اور حمیداں کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرایا: ''ہاں بھئی بھلی مانس! اب کی بار کیا نام رکھو گی بچے کا؟''

''عبدالعزیز۔''

حمیداں کی بات سنتے ہی سراج دین تڑپ اُٹھا، اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی، وہ غصّے سے کھول اُٹھا:

''کیوں بھئی؟ ایک بار پھر مروانا ہے میرا بچہ؟ کوئی اور نام نہیں ملتا کیا؟'' اس کے لہجے میں غصّہ، شکوہ اور طنز نمایاں تھا۔

''اللہ سے خیر مانگیں جی، کیسی باتیں کرتے ہیں!'' حمیداں نے سراج دین کو ٹوکا، پھر پاس بٹھا کر وہ اپنے بھولے میاں کو سمجھانے لگی:

''عبدالعزیز، کتنا پیارا نام ہے۔ 'عزیز' اللہ کے ۹۹ ناموں میں سے ایک ہے۔ بھلا اِس میں خرابی کیا ہے؟ کج فہم لوگوں جیسی باتیں نہیں کرتے، ورنہ اللہ ناراض ہوتا ہے۔ زندگی موت نام کی وجہ سے نہیں، اللہ کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔ آپ ان باتوں پر کان مت دھریں۔''

سراج دین کی نیک سیرت بیوی حمیداں نے اُسے نرمی سے سمجھایا۔

اس آخری دورانیے میں نہم کلاس کے بچے بڑے انہماک سے راجا صاحب کی کہانی سن رہے تھے۔ کہانی سناتے ہوئے راجا صاحب کبھی کبھار ذرا خاموش ہوکر سوچوں میں بھی گم ہوجاتے، لیکن طالب علم پوری طرح کہانی میں دل چسپی لے رہے تھے۔

''بچو! خدا کا کرنا یہ ہوا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی سراج دین اپنے تیسرے بیٹے کا نام ''عبدالعزیز'' رکھنے پر آمادہ ہوگیا، البتہ اس کے دل میں انجانا سا ایک خوف تھا۔ جی میں کئی طرح کے خدشات جنم لے رہے تھے۔ ادھر حمیداں بھی اللہ سے اپنے بیٹے کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگنے لگی۔ وظیفہ پڑھ کر بچے کو دَم کرنا، اسے جی بھر کر پیار کرنا، اس کے چھوٹے چھوٹے نرم ملائم ہاتھوں

کو بار بار چومنا اس کا معمول تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ عبدالعزیز کو اپنی آنکھوں سے ایک لمحہ بھی دور نہ کرے، مگر.....''

راجا صاحب کچھ دیر کو رُکے اور پھر دوبارہ گویا ہوئے:

''مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہ تیسرا بچہ بھی ایک دن پیٹ کی بیماری سے ادھ موا ہو گیا، ماں باپ گڑبڑا گئے۔ بھاگم بھاگ ہر وید، حکیم کا دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن سب کچھ بے سود رہا۔ عبدالعزیز سوم بھی آناً فاناً ان کے ہاتھوں میں دم توڑ گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو حمیداں اور سراج دین سکتے میں آ گئے، پھر ذرا ہوش آیا تو دھاڑیں مار مار کر رونے، چیخنے اور چلّانے لگے۔ یہ آزمائش تھی یا سزا، مگر سراج دین تو بہرحال پاگلوں جیسا ہو چکا تھا۔ حمیداں بھی پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہی تھی۔

'تجھے کتنی بار منع کیا تھا یہ منحوس نام رکھنے سے۔' (نعوذ باللہ!) وہ منہ سے کف اُڑا رہا تھا۔ پریشانی اور غم کی اس گھڑی میں سراج دین نہ جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا۔ بے چاری غم زدہ حمیداں ہچکیاں لیتے ہوئے ان بے ادبانہ الفاظ پر توبہ توبہ کر کے کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔ کبھی وہ سکتے میں آ جاتی تو کبھی غم کی شدت سے غش کھا کر گر پڑتی۔ ایک گھنٹے بعد اُسے ہوش آیا تو گھر میں اہلِ محلہ اور رشتے دار تعزیت کے لیے جمع تھے، جنھیں دیکھ ایک بار پھر اُس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ ہو گیا۔

اِدھر سراج دین قدرت کے اس امر پر جیسے بغاوت پر اُتر آیا تھا۔ مسلسل دھاڑیں مارتے ہوئے وہ بے دھڑک اللہ سے شکوہ کیے جا رہا تھا۔

''خدا سے ڈریں، اللہ کا قہر نازل ہو گا ایسی باتوں پر۔'' اگلی صبح حمیداں نے روتے ہوئے اپنے میاں کو بازو سے پکڑا اور تسلی دینے لگی۔

''تُو چھوڑ مجھے۔ کیا باقی ہے ابھی مزید قہر نازل ہونا؟ میرے تینوں بچوں کی جان لے لی تمھاری اس ضد نے۔ کیوں رکھا میرے بیٹے کا نام عبدالعزیز، کیوں؟'' اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ حمیداں کے لاکھ سمجھانے بجھانے کے باوجود وہ کسی طور ماننے کو تیار نہ تھا۔ اپنے بچوں کی موت کا ذمے دار وہ اپنی بیوی کو ہی قرار دے رہا تھا۔ قریب تھا کہ حمیداں اس کے غصے اور غیظ و غضب کا شکار ہو جاتی، خاندان والوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ بچے کو دفنانے کے بعد ایک بار وہ پھر خالی جھولی لیے بیٹھے تھے۔

''یہ میرے سوہنے اللہ کی نعمتوں کی بے قدری ہے سراج دین! تُو ایسا نہ کر۔'' حمیداں آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔

''چپ کر، تیری زبان ہی کالی ہے۔'' وہ غصے سے دھاڑا۔ حمیداں بے چاری آنسو بہاتی اپنے بچوں کو یاد کرتے ہوئے اللہ کی عدالت میں سوالی بنی کھڑی تھی۔ اسے اپنے پروردگار سے محبت تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ''عبدالعزیز'' جیسے پیارے نام کے بارے میں اس کا شوہر اور باقی رشتے دار کوئی بری سوچ پالیں، چناں چہ وہ اپنے رب کے سامنے گڑگڑائی اور دعائیں مانگنے لگی۔

اگلے سال اللہ پاک نے سراج دین اور حمیداں بی بی کو ایک اور بیٹے سے نوازا، مگر اِس بار گھر میں خوشیاں نہیں، ڈر اور خوف کا راج تھا، گھر والوں کے ساتھ ساتھ حمیداں بھی سہمی ہوئی تھی۔ اتنے میں سراج دین نے اپنے پیارے اور ننھے سے بیٹے کو بانہوں میں اُٹھایا، پھر بیوی کی جانب دیکھ کر بولا: ''اس کا نام عبدالعزیز نہیں، اصغر ہو گا۔'' اُس کا لہجہ سرد اور فیصلہ کن تھا۔

''جی ٹھیک ہے، لیکن..... میں..... میں تو اِسے عبدالعزیز ہی کہوں گی۔'' حمیداں نے نمناک آنکھوں سے کہا تو سراج دین غضب ناک ہو گیا۔ مارے غصے کے اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔

''کیا بک رہی ہے؟ تیری مت ماری گئی ہے کیا؟ ابھی زندہ ہوں میں، یہاں اب میری ہی مرضی چلے گی۔ خبردار! جو کسی نے میرے بیٹے کو ''عبدالعزیز'' کہنے کی کوشش کی، ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔'' گھر کی چیزیں اِدھر اُدھر پٹختے ہوئے سراج دین شاید باؤلا ہی ہو گیا تھا۔ حمیداں بے چاری بستر پر پڑی سہم سی گئی۔ وہ مسلسل رو رو کر اللہ سے اپنے بیٹے کی زندگی اور سلامتی کے لیے دعائیں کرنے لگی:

'اے مالک! سب نام پیارے ہیں۔ تیرے سب ناموں کی شان ہی نرالی ہے۔ اے میرے مولا! عبدالعزیز ہرگز منحوس نام نہیں ہے۔ میں ایسی خرافات اور توہمات پر یقین نہیں رکھتی، تُو ہی اپنا کرم کر، تیرا سوہنا اور پیارا نام اپنے بیٹے کو دیا ہے۔ تُو میرے اس امر کی لاج رکھ لے۔' وہ گڑگڑا کر اپنے رب سے سوال کر رہی تھی، پھر یہ دعا اس کا معمول بن گئی۔ چوتھے بچے کی آمد کے دو ہفتوں بعد حمیداں بستر میں پڑی اپنے لختِ جگر کی بلائیں لے رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اسے سہلا بھی رہی تھی۔ اچانک بچے کی ہچکی بندھ گئی، پھر اُس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔

'ہائے میرا عبدالعزیز.....' بے اختیار حمیداں کے منہ سے نکلا۔ اتنے میں سراج دین بھاگ کر اَندر پہنچ چکا تھا۔ آتے ہی اس نے فرطِ جذبات میں بچے کو اُٹھا کر سینے سے لگایا اور غصے میں حمیداں پر برس پڑا: 'تُو..... تُو ہے ہی منحوس، قاتل ہے میرے بچوں کی۔ بے رحم ہے تُو، نہیں چھوڑوں گا تجھے۔ خبردار! اگر یہ نام آئندہ اپنے منہ سے نکالا تو۔'

اور پھر زندگی میں پہلی بار اُس نے حمیداں پر ہاتھ اُٹھایا دیا۔ حمیداں

حیرت کی بت بنی کبھی شوہر اور کبھی اپنے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ آخر بچہ حمیداں سے دور کرلیا گیا۔ اسے پورے خاندان کی طرف سے طعنے ملنے لگے۔

اسی شام بچے کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو سراج دین گھٹنوں کے بل زمین پر جھکا، پھر ہاتھ اور چہرہ آسمان کی طرف کر کے چیخنے لگا: 'بس کردے یا خدا! بس کردے اب تو۔ ہمیں اتنی ہی تکلیف دے جتنی ہم برداشت کرسکیں۔ اب نہ چھیننا میرا بچہ!' یہ کہہ کر وہ اصغر کو ہاتھوں میں لیے حکیم کی طرف بھاگا۔ پورے تین گھنٹے بعد بچے کی طبیعت میں ذرا بہتری محسوس ہوئی۔ گھر بھر میں سارے رشتے دار جمع ہو چکے تھے۔ بات بات پر حمیداں کو سبھی لوگ کھری کھری سنا رہے تھے، جیسے وہ ماں نہیں، کوئی مجرم ہو۔

'خبردار! اگر اصغر کو چھونے کی یا اسے عبدالعزیز کہنے کی جرأت کی۔ ہاتھ توڑ دوں گا، زبان کھینچ لوں گا۔' سراج دین غصے سے حمیداں پر چلّانے لگا۔

'دور کرلو بچہ اس سے، سایہ بھی نہ پڑے اس ڈائن کا۔ ہائے ہمارا معصوم سا اصغر، نہیں چاہیے ہمیں عبدالعزیز۔' سراج دین کی بہن بھی بھڑک اٹھی تھی۔

ایک دم سے خاندان بھر کے لوگ حمیداں کے پیچھے پڑ گئے۔ ابھی چند روز قبل تو اُس بے چاری کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ وہ زخم ابھی تازہ تھا، پھر تین بچوں کی جدائی اور اَب چوتھے بچے کی آمد پر یہ سلوک، وہ رو رو کر پاگل ہو رہی تھی۔ ماں کو بھی یاد کرتی تو جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ اس رات سردی شدید پڑ رہی تھی۔ بارش بھی خوب ہوئی۔ ادھر حمیداں کی آنکھوں میں بھی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اُس کا لاڈلا کئی گھنٹوں سے اس کی نظروں سے دور تھا۔

رات اس نے انگاروں پر گزار دی۔ وقفے وقفے سے اس کے رونے کی دھیمی آواز کمرے میں گونجتی رہی، مگر کوئی بھی حال چال پوچھنے اس کے پاس نہ آیا۔ رونے دھونے کی ایک آواز دوسرے کمرے سے بھی آتی رہی، جہاں ننھا منا اصغر عرف عبدالعزیز اپنے باپ اور دوسرے گھر والوں کے ساتھ لپٹا رات بھر ''ریں ریں'' کرتا رہا تھا۔ وہ کسی صورت چپ نہیں رہا تھا۔

'سراج دین! کچھ عقل کو ہاتھ مارو! اِسے بھوک لگی ہے۔ بھلا اتنی دیر کوئی بچہ ماں کے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔ کل شام کا بے چارا رو رہا ہے۔' اگلی صبح سراج دین کے چچا نے اسے ڈانٹا۔

'چچا! ویسے تو میں اپنے بیٹے پر اُس منحوس کا سایہ بھی نہ پڑنے دوں، مگر کیا کروں، یہ چپ بھی نہیں ہو رہا۔ میرے خیال میں حمیداں کے لیے اتنی ہی سزا کافی ہے۔ اب اس کا دماغ ٹھکانے آچکا ہوگا۔' سراج دین بڑبڑایا، پھر بلبلاتے اصغر کو ہاتھوں میں اٹھائے حمیداں کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

حمیداں کے کمرے سے رونے کی آواز بند ہوگئی تھی۔ 'شاید وہ سوگئی ہو۔' یہ سوچتے ہوئے سراج دین کمرے میں داخل ہوا۔ یہ دیکھ کر اُس کے پاؤں سے زمین ہی نکل گئی کہ حمیداں بے حس و حرکت اپنے بستر پر پڑی تھی۔

'حمیداں..... حمیداں! کیا ہوا حمیداں! اِدھر دیکھو!' سراج دین نے بچہ ایک طرف رکھا اور اُسے بُری طرح جھنجوڑ کر آوازیں دینے لگا۔''

راجا صاحب کہانی سناتے ہوئے ذرا جذباتی ہوگئے۔ پوری کلاس کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ راجا صاحب بار بار رومال سے اپنی آنکھیں صاف کر رہے تھے۔ نہم کلاس کے طالب علم حیران تھے کہ بھلا کہانی کی وجہ سے راجا صاحب کیوں افسردہ ہیں۔

''بچو! اُس رات حمیداں کو اللہ نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اب کی بار اُس کا بیٹا نہیں، بل کہ وہ خود اللہ کے دربار میں حاضر ہوگئی تھی۔ بے چاری کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں۔ شاید ساری رات رونے کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ مرتے وقت اس نے اپنے اللہ سے کیا باتیں کیں، کس کی شکایت لگائی اور کیا کیا شکوہ کیا، کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔

سراج دین کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی، لیکن بچوں کے معاملے میں وہ ذرا غصہ کر گیا تھا۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ حمیداں کی لاش پر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ کبھی اس کے چہرے پر نظر دوڑاتا اور کبھی اپنے ننھے بیٹے کو اُٹھا کر پیار کرتا۔ جانے اَن جانے میں وہ کتنی بڑی غلطی کر چکا ہے، اسے اب جا کر اندازہ ہوا تھا۔

گھر بھر میں ایک بار پھر کہرام مچا۔ رشتے دار ہلکان ہوئے، تدفین سے فراغت کے بعد سبھی گھر لوٹے تو گھر کی فضا بے حد سوگوار تھی۔ ننھا اصغر رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ اس کی حالت کسی سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ ایسے میں اس کی پھوپھی آگے بڑھی۔

''ادھر آ میرا اصغر! بے چارہ معصوم ننھا سا فرشتہ! میں صدقے جاؤں۔'' اتنا کہہ کر پھوپھی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

'نہیں بہن! یہ اصغر نہیں.....' سراج دین رونے لگا: 'یہ..... یہ میرا عبدالعزیز ہی ہے۔ حمیداں کا عبدالعزیز! یا اللہ! مجھے معاف کردے۔' سراج دین کی نمناک آنکھیں اور چہرہ آسمان کی طرف تھا۔ وہ اپنی غلطی پر بے حد نادم تھا۔

حمیداں کی یاد آتی تو اُس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ عبدالعزیز کی پرورش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ماں کے بغیر بھلا بچہ کیا زندہ رہے؟

دن گزرنے لگے۔ بچہ بڑا ہونے لگا۔ اس کا باپ اسے عبدالعزیز کہہ کر پکارتا، جب کہ پھوپھی اور دیگر گھر والوں نے جان بوجھ کر اُسے ججو کہنا شروع کر دیا۔ اب وہ قدم قدم چلنے لگا تھا۔ ایک حیران کن بات یہ کہ اس کی پیدائش کے بعد سراج دین کے گھر خوش حالی اور دولت کی ریل پیل ہوگئی تھی۔ اس کے سارے قرض اتر گئے۔ کھیتوں میں پیداوار بھی پہلے سے بڑھ کر تھی۔

سراج دین روزانہ صبح حمیداں کی قبر پر جاتا، اللہ کے حضور گڑگڑاتا اور معافی مانگتا۔ کبھی کبھار تو اُس کے ساتھ عبدالعزیز بھی ہوتا تھا، جسے سراج دین کے علاوہ باقی محلے والے بھی ججو ہی کہتے تھے، البتہ کاغذوں میں اس کے نام کے ساتھ اصغر بھی درج تھا۔ کئی مہینے اور سال گزر گئے۔ قیامِ پاکستان کے وقت جب لوگ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے لگے تو سفر کی تھکن اور بخار کی وجہ سے سراج دین بیمار ہوا اور پھر کچھ دنوں بعد اللہ کو پیارا ہوگیا۔ عبدالعزیز جو کہ اس وقت چوتھی جماعت کا طالب علم تھا، اپنے چچا اور پھوپھی کے ساتھ رہنے لگا۔''

راجا صاحب نے کہانی ختم کرتے ہوئے اپنا رومال تہ کیا۔ ان کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ کمرے میں اس وقت گہرا سکوت تھا اور راجا صاحب بے حد غمگین.....

ٹن ٹن ٹن..... اتنے میں چھٹی کی گھنٹی بج اٹھی۔ باہر ایک شور سا ہونے لگا۔ راجا صاحب اپنی کرسی سے اٹھے۔ کلاس پر ایک نظر ڈال کر ابھی وہ باہر جانے ہی والے تھے کہ عاطف کے ساتھ بیٹھے ججو کی آواز ابھری۔

''سس..... سر!.....'' راجا صاحب نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے قدم روکے اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''بچو! آج اسکول میں میرا آخری دن تھا۔ ہوسکتا ہے آج کے بعد ملاقات نہ ہو۔''

''لیکن سر..... وہ..... کہانی!'' عاطف اور مانی بھی بول اٹھے۔

''تم لوگ جاننا چاہتے ہوگے کہ اُس عبدالعزیز کے ساتھ پھر کیا ہوا؟''

''جی سر!'' پوری کلاس کی آواز گونجی۔

''عبدالعزیز عرف ججو، حمیداں اور سراج دین کا لختِ جگر، یعنی راجا عبدالعزیز اصغر..... آج اس اسکول سے تمھیں اللہ حافظ کہہ رہا ہے۔''

راجا صاحب نے گلوگیر لہجے میں کہا اور جاتے جاتے بازو کی کمان بنا کر آنکھوں پر رکھ لی۔ بچے ایک دم سکتے میں آگئے۔ دراصل نئے پرنسپل نے آتے ہی بقول ان کے اسکول پر بوجھ بنے چند ملازمین کو فارغ کرنے کا اعلان کیا تھا، جن میں ایک نام راجا صاحب کا بھی تھا۔ بچوں نے کلاس سے باہر آ کر دیکھا کہ جھریوں بھرے چہرے پر اُداسی لیے راجا صاحب اپنی پرانی سائیکل نکال رہے تھے۔ حیرت کا مجسمہ بنے کلاس نہم کے طلبہ انھیں جاتا دیکھ رہے تھے۔

کسی کی سمجھ میں نہ آسکا کہ جاتے ہوئے راجا صاحب کی آنکھوں میں آنسو اپنے ماں باپ کی یاد میں تھے یا نوکری چھن جانے کا غم، کیا پتا ان کے دماغ میں جوان بیٹے کی موت کا منظر ہو یا چار غیر شادی شدہ بیٹیوں کی ذمے داری کا درد۔ بہرحال اس دن کے بعد اُنھیں کسی نے اس اسکول میں نہیں دیکھا۔ سائیکل پر پیڈل مارتے ہوئے اسکول سے رخصت ہوتے وقت راجا عبدالعزیز آج کسی دوسری دنیا کی مخلوق لگ رہے تھے اور پوری کلاس اشک بار تھی۔

.....☆.....

نوٹ: چند ماہ قبل ہمارے استادِ محترم راجا عبدالعزیز صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ ذوق وشوق کے تمام قارئین سے استدعا ہے کہ ان کے لیے دعائے مغفرت کردیں۔ مصنف

بقیہ: دور نہیں رہ سکتا

بابا نے مجھے غور سے دیکھا، پھر آہستہ سے بولے۔ ''ہاں یار، یہ تو صحیح ہے۔ مجھے تو اُن کے سامنے اتنی شرم آئے گی کہ میں تو مر جاؤں گا!''

''مگر بابا! وہاں تو موت ہوگی ہی نہیں۔ بس شرمندگی ہی شرمندگی ہوگی۔''

اچانک بابا اٹھے۔ انھوں نے اسٹیکر کا ڈبا اٹھا کر کچرے میں ڈال دیا۔ سِکرین والا پانی زمین پر گرایا اور کہنے لگے:

''میں اپنے نبی ﷺ سے دور نہیں رہ سکتا!''

انھوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور رونے لگے۔

ہم نے اسٹیکر لگانا بند کر دیے، سکرین استعمال کرنا بند کر دی، مگر عجیب بات ہوئی۔ ہمارے پھل پہلے سے زیادہ بکنے لگے۔

پیارے دوستو! آپ بھی سنتوں پر عمل کر کے دیکھیں، سب کچھ بدل جائے گا اور سب سے بڑھ کر ہمیں اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ہمیشہ ساتھ مل جائے گا۔

ابن غلام

عشرت زاہد۔ کراچی

فجر کے بعد کا وقت تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی، جس کی وجہ سے ہوا میں ہلکی سی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ فضلو جلدی جلدی چارہ کاٹ رہا تھا، تاکہ جانوروں کو چارہ ڈال کر جلدی سے کھیتوں کا رُخ کر سکے۔ اتنے میں اس کی بیوی سکینہ نے گرم روٹی پر مکھن رکھا اور چائے کی پیالی کے ساتھ چارپائی پر لا کر رکھ دیا۔ فضلو نے صحن میں لگے ہینڈ پمپ سے ہاتھ دھوئے اور ناشتا کرنے لگا۔ ابھی آخری نوالا منہ میں ڈال کر فارغ ہوا ہی تھا کہ کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر ماسٹر شکیل آتے ہوئے نظر آئے۔

''ماسٹر صاحب! آپ؟ صبح صبح؟ خیریت تو ہے نا!؟ مجھے بلوا لیا ہوتا۔ عبداللہ کی کوئی شکایت تو نہیں لے کر آئے؟''

''وعلیکم السلام! ارے نہیں فضل احمد! میں تو اِس وقت تمھیں مبارک باد دینے آیا ہوں۔ تمھیں پتا ہے، تمھارا بیٹا میٹرک کے امتحان میں اول آیا ہے۔ پورے ضلع میں اول نمبر آیا ہے اور حساب میں تو اُس نے پورے سو نمبر لیے ہیں۔ تمھیں بہت بہت مبارک ہو!''

''یہ تو کمال ہو گیا جی، اللہ کی مہربانی ہے۔''

''اور اُسے اسکالر شپ بھی ملی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ آگے پڑھنے کے لیے وظیفہ بھی ملے گا۔ تمھیں بہت بہت مبارک ہو۔''

''خیر مبارک جی! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ پورے ضلع میں اول آیا ہے! ماشااللہ! اب اسے آگے پڑھنے کے لیے سرکاری وظیفہ بھی ملے گا؟ اچھا اچھا! یہ تو کمال ہی ہو گیا جی۔ عبداللہ! اوے عبداللہ! ادھر آ پتر۔ دیکھ ماسٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں!''

عبداللہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔

''جی ابا جی! السلام علیکم ماسٹر صاحب!''

''وعلیکم السلام بیٹا! تم نے ضلع بھر میں اول پوزیشن حاصل کی ہے، ماشااللہ!'' انھوں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

''سچ ماسٹر صاحب!؟'' اس کی آنکھ خوشی سے چمک اٹھی تھیں، چہرہ کھل گیا تھا۔

''جی ماسٹر صاحب! یہ سب تو آپ کی مہربانی ہے۔ آپ نے اسے اتنا اچھا پڑھایا ہے۔''

''ارے نہیں بھائی! عبداللہ تو خود ہی بہت ذہین لڑکا ہے۔ اب تم اسے آگے ضرور پڑھانا۔''

''جی جی ماسٹر صاحب! ہم بھی تو اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتے ہیں، لیکن شہر میں داخلہ مشکل ہے۔''

''ارے نہیں میرے بھائی! تمھیں پتا ہے، اس کا شہر کے کالج میں داخلہ بھی مفت ہوگا۔ بس تمھیں اس کے وہاں رہنے کا بندوبست کرنا ہوگا۔ اگر تم چاہو تو

داخلے کے لیے میں ساتھ چل سکتا ہوں۔ مجھے بتا دینا جب چلنا ہو۔'' یہ کہتے ہوئے ماسٹر صاحب نے چائے کی پیالی نیچے رکھی اور کھڑے ہو گئے۔

''اللہ حافظ ماسٹر صاحب! بہت شکریہ! بڑی مہربانی آپ کی، اللہ حافظ جی۔''

ان کے جاتے ہی سکینہ باہر آ گئی۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''یا اللہ! تیرا شکر ہے، میرے عبداللہ نے تو خاندان کے ساتھ پورے گاؤں کا نام روشن کر دیا۔ ہم اسے ضرور آگے پڑھائیں گے، بڑا آدمی بنائیں گے۔ شہر میں خالہ جی کا بیٹا شاہد رہتا ہے نا! عبداللہ اس کے گھر میں رہ لے گا۔ کیا خیال ہے؟

''ہاں، ہاں، بھئی ہاں!'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ذرا صبر۔ کچھ سوچنے سمجھنے دو۔ تم نے تو سارے فیصلے کر بھی لیے۔ چلو، اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ ابھی میں کھیتوں میں کچھ کام نمٹا کر آتا ہوں۔ واپسی میں بشیر حلوائی سے مٹھائی بھی لیتا آؤں گا۔''

پھر سب پاس پڑوس میں، اسکول اور مسجد میں مٹھائی بانٹی گئی اور سب لوگوں سے مبارک باد وصول کرتے کرتے شام ہو گئی۔ رات کو سب بچے سو چکے تھے، لیکن سکینہ اور فضلو کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ دونوں دیر تک عبداللہ کے مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

سکینہ نے یاد دِلایا کہ ''صبح چوہدری صاحب کے پاس مٹھائی لے کر جانی ہے۔ وہ بہت خوش ہوں گے اور اُن سے شہر جانے کی اجازت بھی لے لینا۔''

''اری نیک بخت! مجھے تو کچھ خوف محسوس ہو رہا ہے ان سے بات کرتے ہوئے، کیوں کہ آج تک گاؤں کا کوئی بھی بچہ شہر پڑھنے نہیں گیا، سوائے چوہدری صاحب کے بیٹے کے۔ پتا نہیں وہ کیا کہتے ہیں؟''

نہیں نہیں، فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھیں یاد نہیں ہے کیا! جب چوہدری صاحب حج پر گئے تھے تو اُن کے انجینئر بیٹے نے حویلی کا سامنے کا حصہ توڑ کر کچھ ردو بدل کر کے بالکل تبدیل کر دیا تھا۔ سارے گاؤں والے ڈر رہے تھے کہ چوہدری صاحب جب واپس آئیں گے تو بہت ناراض ہوں گے کہ آباء واجداد کی نشانی کو بدل دیا، لیکن جب وہ واپس آئے تو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے اور اپنے کھلے دل کا ثبوت دیا تھا اور کہا تھا کہ ''دیکھا، تعلیم بہت ضروری ہے، میرے انجینئر بیٹے نے حویلی کو تبدیل کر کے بالکل بنگلہ بنا دیا۔''

''ہاں مجھے یاد تو ہے، لیکن دل میں کچھ خوف محسوس ہو رہا ہے۔ چلو خیر، اب سو جاتے ہیں۔''

صبح سکینہ نے صاف ستھرا جوڑا نکال کر عبداللہ کو دیا۔

''جا پتر! جلدی سے نہا کر تیار ہو جا۔ چوہدری صاحب کے پاس جانا ہے نا!''

دونوں باپ بیٹے ناشتا کر کے مٹھائی لے کر خوشی خوشی حویلی کی طرف چل دیے۔ فضلو کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ تیز تیز چلتے ہوئے وہ حویلی پہنچے، جو اَب ایک جدید طرز کے بنگلے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ چوہدری صاحب اپنے صحن میں آرام کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور ساتھ ہی منشی بیٹھا کچھ حساب کتاب کر رہا تھا۔

''السلام علیکم سرکار!''

''وعلیکم السلام فضلو! واہ بھائی! کل سے گاؤں بھر میں مٹھائیاں بانٹتا پھر رہا ہے اور ہمارے پاس آج آیا ہے۔ تیرا پتر پاس ہوا ہے نا!''

''سرکار! میں معافی چاہتا ہوں۔ بس جی کل سارا دن لوگ گھر پر آتے رہے مبارک دینے تو شام ہو گئی تھی۔ میں بس اسی لیے آج سویرے سویرے ہی چلا آیا ہوں۔ یہ عبداللہ بھی ساتھ ہی ہے۔''

''اچھا اچھا، چل تجھے مبارک ہو۔ یہ لے پتر!'' یہ کہتے ہوئے چوہدری صاحب نے جیب سے کڑکتا ہوا سو روپے کا نوٹ نکال کر عبداللہ کو پکڑایا۔ عبداللہ نے جھجکتے ہوئے پہلے اپنے ابا کی طرف دیکھا اور پھر نوٹ لے لیا۔

''سرکار! بڑی مہربانی ہے آپ کی۔ اسے حساب میں پورے سو نمبر ملے ہیں اور سرکار! عبداللہ کو آگے پڑھنے کا وظیفہ بھی ملا ہے۔''

''اچھا، یہ تو بہت اچھی بات ہے، لیکن گاؤں میں تو آگے کالج ہے ہی نہیں۔''

''جی، میں سوچ رہا ہوں کہ اسے شہر میں پڑھنے بھیج دوں۔ میری خالہ کا لڑکا رہتا ہے وہاں۔ اس کے گھر رہ لے گا اور مہینے پندرہ دن بعد آ کر مل لیا کرے گا یا کبھی میں چلا جاؤں گا۔''

''اچھا اچھا تو تُو نے سارا کچھ پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔'' چوہدری صاحب کا لہجہ کچھ بدلا ہوا محسوس ہوا تو فضلو نے سر اُٹھا کر سہم کر اُن کی طرف دیکھا۔

''جی سرکار!''

''کوئی ضرورت نہیں ہے شہر بھیجنے کی۔ بے کار ہے۔ لڑکے بگڑ جاتے ہیں گھر سے دور رہ کر۔ بس دس جماعتیں کافی ہیں۔ مجھے بھی یہاں آموں اور کنو کے باغوں کے حساب کتاب کے لیے ایک ہوش یار آدمی کی ضرورت ہے۔ تُو کہہ رہا ہے کہ نا کہ حساب میں پورے سو نمبر ملے ہیں!''

''لیکن سرکار!.....''

چل کچھ تنخواہ بھی باندھ دوں گا اس کی۔ ارے فضلو! پیسے کام آئیں

گے تیرے۔‘‘

’’نہیں نہیں سرکار! اسے آگے پڑھنے کا بہت شوق ہے اور ہمارا بھی بڑا اَرمان ہے اسے پڑھانے لکھانے کا، بڑا آدمی بنانے کا۔ پڑھ لکھ کر بھی تو یہ آپ ہی کی خدمت کرے گا نا! بس کچھ سالوں کی بات ہے، پھر تو اِسے واپس یہیں آنا ہے۔ مائی باپ! ہم تو آپ کے جدی پشتی غلام ہیں۔ آپ ہی کی خدمت کریں گے۔ ہم کہاں جائیں گے جی۔ بس آپ اپنا یہ حکم واپس لے لیں۔‘‘

’’بس تجھے ایک دفعہ کہہ دیا نا! بہت ہوگئی پڑھائی وڑھائی۔ تیرے دماغ میں یہ بات نہیں آرہی کیا؟ چلا ہے بڑا آدمی بنانے۔ کیوں اسے سر پر چڑھا رہا ہے؟ کل سے میرے پاس بھیج دے اسے اور اَب جا۔ مجھے کچھ کام کرنے دے۔ دماغ خراب کر دیا صبح صبح۔‘‘

’’سرکار! یہ تو بڑا ظلم ہو جائے گا جی!‘‘

’’کیا کہا!؟‘‘

چودھری صاحب کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئی تھیں۔ وہ زور زور سے حقے کے کش لینے لگے۔ پھر زور سے دھاڑے: ’’دفع ہو جا یہاں سے۔‘‘

فضلو سر جھکا کر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ جو قدم آتے وقت زمین پر نہیں ٹک رہے تھے وہ اب من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ مرے مرے قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہوا اور سارے راستے سوچتا رہا کہ کیا ہماری نسل دَر نسل خدمتوں اور غلامی کا یہی صلہ ہے!؟

ابو غازی محمد۔ کراچی

یہ کُل پانچ اشارات ہیں۔ آپ ان کی مدد سے درست جواب تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ اگر آپ ان اشارات کے ذریعے جواب تک پہنچ جائیں تو بُوجھا گیا جواب آخری صفحے پر موجود کوپن کے ساتھ ہمیں ارسال کر دیجیے اور اپنی معلومات کا انعام ہم سے پائیے۔ آپ کا جواب ۳۰، نومبر تک ہمیں پہنچ جانا چاہیے۔

۵۸

یہ کون ہیں؟

۱ یہ اسلام کے ابتدائی دور کے ایک عظیم فاتح اور سپہ سالار ہیں۔

۲ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں برِّ اعظم افریقہ کا ایک ملک ’’تیونس‘‘ فتح کیا اور تیونس کے قریب ایک مناسب مقام پر فوجی چھاؤنی قائم کی۔ اسی مقام پر بعد میں ایک شہر آباد ہوا، جس نے ’’قیروان‘‘ کے نام سے عالم گیر شہرت حاصل کی۔

۳ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اور بھی کئی شہر فتح کیے اور فتوحات کا پرچم لہراتے ہوئے شمالی افریقہ کی آخری حد مراکش تک پہنچ گئے۔ آگے ’’بحرِ اوقیانوس‘‘ تھا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے بے اختیار اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا، لیکن موجوں نے آگے نہ بڑھنے دیا۔ اس موقع پر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

’’اے اللہ! اگر میرے راستے میں سمندر نہ آجاتا اور زمین کی حد ختم نہ ہو جاتی تو فتح کا پرچم لہراتا اور توحید کے نعرے بلند کرتا چلا جاتا۔‘‘

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے اس واقعے کو اِس طرح نظم کیا ہے ؎

دشت تو دشت ہیں ، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظُلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

۴ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ حکومت میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کو افریقہ کے ’’بربر‘‘ قبائل کی فتنہ انگیزیوں کے خاتمے کے لیے روانہ کیا تھا۔

۵ ۶۸۳ء میں ایک بربر سردار نے (جو صرف ظاہراً مسلمان ہوا تھا) آپ رحمۃ اللہ علیہ کو دھوکے سے الجزائر کے مشہور مقام ’’بسکرہ‘‘ میں شہید کر دیا۔ اب یہ مقام آپ رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے منسوب ہے۔

بلاعنوان ۱۵۹

ام محمد احمد۔ کراچی

''ابا! مجھے چپس کھانے ہیں۔'' میں نے للچائی نظروں سے دکان پر رنگ برنگے چپس کے پیکٹوں کو دیکھا جو ہوا سے دکان کے بیچوں بیچ فضا میں جھول رہے تھے۔

ابا نے میری نظروں کے تعاقب میں دکان کی طرف دیکھا اور ڈانٹ دیا:

''یہ کھا کر بیمار ہونا ہے کیا!؟ بیمار ہو جاؤ گے تو اِسکول کی چھٹیاں ہو جائیں گی۔ ابھی کچھ دنوں بعد اِمتحان ہونے والے ہیں۔''

یہ کہہ کر سائیکل کے پیڈل پر زور زور سے پاؤں مارنے لگے۔ سائیکل پر لگی آگے چھوٹی سی سیٹ پر میں بیٹھا مڑ مڑ کر اُس دکان کی طرف دیکھتا رہا۔ جب وہ دکان نظر آنی بند ہو گئی تو منہ بسور کر بیٹھ گیا، حالاں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ابا نے کہاں مجھے چپس دلوا دینے تھے؟ اسکول آ چکا تھا۔ ابا نے ہاتھ پکڑ کر مجھے نیچے اُتارا، پیچھے سے بستہ اُتار کر میرے دونوں بازوؤں میں پہنا کر اِسکول کی طرف دھکیل دیا۔ میں ابا کو دیکھے بغیر اِسکول کے اندر داخل ہو گیا۔ مجھے پتا تھا کہ ابا مجھی کو دیکھ رہے ہوں گے۔ جب تک میں اسکول میں داخل نہیں ہو جاتا تھا ابا وہیں کھڑے رہتے تھے۔ میں عمارت میں داخل ہو کر اَبا کو پلٹ کر دیکھتا تھا اور ہاتھ اُٹھا کر اُنھیں خدا حافظ کہتا تھا، لیکن آج میں ناراض تھا۔ کیا ہو جاتا اگر ابا مجھے چپس کا ایک پیکٹ دلا دیتے!؟

ابا سے پورے دن میں صبح ہی ایک گھنٹے کی ملاقات ہوتی تھی، اس لیے کہ جب ابا رات کو گھر آتے تو ہم سب بہن بھائی سو چکے ہوتے تھے۔ صبح امی اسکول کے لیے اُٹھاتیں تو اُس وقت نیند میں جھومتے جھامتے اسکول کے لیے تیار ہوتا اور ناشتا کرتا۔ ابا باہر نکل کر سائیکل کی گھنٹی بجاتے اور ساتھ میں آوازیں بھی دیتے: ''راحیل! جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے۔''

میرا اِسکول دور تھا، جب کہ تینوں بہنوں کو قریب کے اسکول میں داخل کروایا گیا تھا۔ بقول ابا کے: اچھی تعلیم کے لیے اسکول بھی اچھا ہونا چاہیے اور میں ایک ہی بیٹا تھا، جس کے لیے اچھی تعلیم ضروری تھی، لیکن ابا کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اچھے اسکول میں بچے بھی اچھے گھرانوں کے ہوتے ہیں۔ وہ اچھا لنچ بھی لے کر آتے ہیں اور میں ''بے چارہ''۔

امی ایک پراٹھا بنا دیتیں۔ اس پر رات کا سالن رکھ دیتیں جو عموماً سبزی ہوتی، کبھی پراٹھے میں چینی ڈال دیتیں اور وہ میٹھا پراٹھا بن جاتا۔

مہینے کے شروع میں کسی دن امی انڈا اور ڈبل روٹی کا سینڈوچ بنا کر دے دیتیں، اس دن میں لنچ بہت شوق سے کرتا۔ میرے خیال میں انڈا ڈبل روٹی امیر لوگوں کا کھانا ہوتا تھا، جب کہ ابا اس پر ناراض ہوتے:

''کیوں فضول خرچی کرتی ہے نیک بخت!؟''

اور اِس وقت ابا بہت بُرے لگتے۔

اتوار کے دن ابا صبح کے وقت گھر پر ہوتے اور وہ دن مجھے اپنا گھر جیل خانہ لگتا، کیوں کہ اس دن ابا مجھے صبح ہی اُٹھا دیتے۔ ناشتا کرتے ہی اپنی سائیکل کی صفائی میں لگ جاتے۔ اس پر پہلے تیل کی مالش کرتے اور پھر سرف اور پانی سے غسل کرواتے اور مجھے ساتھ ساتھ رکھ کر آدھا کام مجھ سے کرواتے۔ کبھی گھر کی پرانی چیزوں کی ٹھوکا پیٹی کرتے رہتے۔ ایک ابا کا شور، دوسرا اَوزاروں کا شور، گویا ایک ہنگامہ برپا ہوتا۔ ابا اِتوار کو گھر پر کیوں ہوتے ہیں؟ یہ سوچ ہر اِتوار کی صبح میرے دماغ پر سوار رہتی۔

......☆......

''امی! میرا اِسکول کا جوتا ٹوٹ گیا ہے۔'' میں جوتا ہاتھ میں لے کر امی کے پاس آیا، جس کی ایڑی کا تلا نکل گیا تھا۔

امی نے جوتا اپنے پاس رکھ لیا۔

''شام کو ابا آئیں گے تو وہ جوڑ دیں گے۔''

''نہیں، مجھے نیا چاہیے۔ ایک سال سے بھی زیادہ ہو گیا ہے اور ویسے بھی تھوڑی مشکل سے پاؤں میں آتا ہے۔''

شام کو ابا آئے تو اُمی نے جوتے کا بتا دیا۔ میں کمرے میں اپنا اسکول کا کام کر رہا تھا۔

ابا ہفتے کے دن شام کو چار بجے تک آ جاتے تھے اور دو گھنٹے بعد چھے بجے پھر چلے جاتے اور رات دیر سے لوٹتے تھے۔

بہترین عنوان تجویز کرنے پر 500، دوسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 300، تیسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 200 روپے انعام دیا جائے گا۔ ''بلاعنوان'' کے کوپن پر عنوان تحریر کرکے ارسال کریں۔

عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 30 نومبر 2020ء ہے۔

نوٹ: کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابلِ قبول نہ ہوگا۔

ابا، امی کی بات سنتے ہی فوراً جوتا ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگے۔

''ارے، تلا نکلا ہے، ابھی جُڑ جائے گا۔''

''پانی، چائے وغیرہ پی لیں، بعد میں جوڑ دیجیے گا۔'' امی نے بڑی بہن کو پانی اور چائے لانے کو کہا۔

''پہلے اسے دیکھ لوں۔ کل اتوار ہے، کل تک جُڑ جائے گا۔'' یہ کہہ کر اَبا نے اسے اچھی طرف صاف کیا، یعنی خوب رگڑا اور چیزوں کو جوڑنے والا سلوشن لگا کر جوتے کو پلنگ کے پائے کے نیچے دبا دیا اور میری طرف مسکرا کر دیکھا:

''راحیل! فکر نہ کرو، پیر تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسا پکا جوڑا ہے کہ دوبارہ نہیں ٹوٹے گا۔''

''اللہ نہ کرے کہ یہ اتنا پکا جُڑے۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

''یہ دیکھو، تین سال پہلے میں نے اپنی چپل جوڑی تھی، ابھی تک چل رہی ہے۔'' ابا کی بات پر میں نے بے اختیار اَبا کی چپل کی طرف دیکھا، جس کا تلا واقعی جُڑا ہوا تھا، لیکن اوپری حصے کی حالت خستہ تھی۔ دو، تین جگہ سلائی بھی کی گئی تھی، جو چل نہیں رہی تھی، بل کہ زبردستی چلائی جا رہی تھی۔

بے اختیار میری ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ ابا اپنی چپل اتنی زیادہ ٹوٹنے پر ہنس رہے تھے تو مجھے کیسے نئی لے کر دے دیتے؟ اور اِس وقت مجھے ابا بہت بُرے لگے۔

میری ہر چیز تینوں بہنوں سے اچھی ہوتی تھی۔ کپڑے، جوتے، اسکول کا بستہ، لنچ باکس، پانی کی بوتل، وغیرہ وغیرہ، لیکن وہ بہنوں کی چیزوں سے اچھی ہوتی تھیں، اسکول کے بچوں کی چیزوں سے نہیں۔

بہنوں کا عید پر ایک ایک جوڑا آتا اور میرے تین۔ اس کے باوجود بہنوں کے چیزوں پر زیادہ خوشی نظر آتی۔

گھر میں ایک ہی کمرا تھا جو بہت چھوٹا تو نہیں تھا، لیکن اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ جس میں امی، ابا، تینوں بہنیں اور میں بھی سو سکیں، اسی لیے ابا ہمیشہ باورچی خانے اور غسل خانے کے سامنے، یعنی گھر کے داخلی دروازے کے ساتھ جہاں پر اُن کی سائیکل بھی کھڑی ہوتی، چارپائی بچھا کر سو جاتے، جو دِن میں دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی جاتی تھی، تاکہ جگہ کشادہ لگے۔

رات ابا دیر سے آتے تھے۔ پہلے سائیکل کھڑی کرتے اور پھر اُس کے آگے چارپائی بچھاتے، یعنی دیر سے گھر آنے پر بستر بھی خود بچھانا پڑتا۔

میں دوستوں سے، یعنی کلاس کے ساتھیوں سے سنتا تھا کہ ہم ہفتے کے دن اپنے پاپا کے ساتھ کہیں نہ کہیں گھومنے جاتے ہیں تو میرا بھی دل چاہتا کہ ہم سب بھی ابا کے ساتھ کہیں جائیں۔ کیا ہوا جو ہمارے پاس گاڑی نہیں ہے، رکشے یا ٹیکسی میں چلے جائیں گے اور اِسی لیے ایک ہفتے، ابا کے گھر آنے پر میں نے فرمائش کر دی:

''ابا! کہیں پارک یا سمندر پر لے کر چلیں۔ میری کلاس کے بہت سارے بچے اپنے پاپا کے ساتھ گھومنے جاتے ہیں۔''

ابا یہ سن کر ایک دم خاموش ہو گئے، پھر کہا:

''ہاں ہاں، ہم بھی چلیں گے کسی دن۔''

''آج کیوں نہیں؟'' میں نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔

''راحیل! ضد نہیں کرتے۔'' امی نے ٹوکا۔

''میں لے جاتا آج، لیکن سب میرا اِنتظار کر رہے ہوں گے۔''

''کون سب!'' میں نے ابا کو دیکھا جو کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔

''میرے دوست! جہاں میں روز جاتا ہوں۔ اگلے ہفتے کا انھیں بتا دوں گا، پھر ہم چلیں گے، آج نہیں رُک سکتا۔''

اور مجھے ابا بہت بُرے لگے، کیوں کہ وہ ہفتہ پھر کبھی نہیں آیا۔

.....☆.....

دو بڑی بہنوں نے میٹرک کر لیا تھا اور وہ دونوں گھر کے کام کرنے کے بعد امی کے ساتھ کپڑے سلائی کرتی رہتیں، جب کہ تیسری بہن جو مجھ سے چھوٹی تھی، وہ اسکول جاتی تھی۔

جیسے جیسے میں پڑھائی آگے بڑھ رہا تھا میری پڑھائی مشکل ہوتی جا رہی تھی اور اِس کے لیے مجھے رات دیر تک پڑھائی کرنی پڑتی۔ اس دوران میں مجھے پتا چلا کہ میری تعلیم کے لیے میری ماں اور بہنیں راتوں کو جاگ کر بھی محنت کر رہی ہیں۔ دن بھر سلائی اور رات میں کپڑوں پر ہاتھ سے سندھی کڑھائی کر رہی ہوتیں، لیکن ابا کو اِس کی پروا نہیں تھی، وہ اپنے دوستوں میں مگن تھے۔

وقت کا کام آگے بڑھنا ہوتا ہے اور وہ بڑھتا گیا۔ میرا او۔ لیول مکمل ہوا اور پھر اے۔ لیول بھی۔

مسئلہ اب یونیورسٹی میں داخلے کا تھا۔ میری کلاس کے لڑکے مشہور پرائیوٹ یونیورسٹیوں میں جا رہے تھے، جب کہ میرے پاس سرکاری یونیورسٹی میں داخلے کے بھی پیسے نہیں تھے۔

امی اور بہنیں محنت کر کے ہلکان ہو رہی تھیں، اس کے باوجود اِتنے پیسے

نہیں ہو سکے کہ میں پہلے سمسٹر کی بھی فیس بھر سکوں۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا کہ ”یا اللہ! پہلے سمسٹر کی فیس کا انتظام کروادے، دوسرے کے لیے میں خود کہیں جاب کرلوں گا۔“

ایک دو دن میں فیس جمع کروانی تھی اور پھر آخری تاریخ کو امی نے مجھے پچاس ہزار روپے دیے۔

”یہ لو، اپنی فیس جمع کروادو۔“

”امی! یہ..... پیسے کہاں سے آئے؟“

”بیٹا! فاطمہ کے لیے کانوں کی بالیاں بنوائی تھیں۔ بیس ہزار کی وہ بکی ہیں اور تیس ہزار تمھارے ابا اپنے کسی دوست سے اُدھار لائے ہیں۔ کمیٹی ڈال کر اُدھار اُتار دیں گے۔“

”اوہ، ابا نے بھی فکر کی!“

وہی ابا جو اَب رات کو تین بجے گھر آنے لگے تھے۔

پتا نہیں، امی ابا کو کچھ کہتی کیوں نہیں ہیں؟

.....☆.....

اسکول کے دو دوستوں نے میری یونی ورسٹی میں بھی داخلہ لیا تھا۔ ان سے کلاس کے باقی لڑکوں کے متعلق بھی پتا چل جاتا تھا۔

ایک دن میں یونی ورسٹی کے ڈپارٹمنٹ سے نکل کر جا رہا تھا کہ اسکول کے دوست فرحان نے بائیک قریب لا کر روکی۔ وہ بطورِ خاص مجھ سے ملنے یونی ورسٹی آیا تھا اور دعوت دینے بھی۔ اے۔ لیول مکمل کرنے کی خوشی میں اس کے والدین گھر پر پارٹی کر رہے تھے۔ اس نے بہت تاکید کی کہ تم بھی ضرور آنا، سب کلاس فیلو آ رہے ہیں۔

وہ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اُس کی پارٹی میں جانے کے لیے کپڑے جوتے سب چاہیے تھے۔ یہ مسئلہ بھی بڑی بہن نے ہی حل کیا جو مجھ سے صرف تین سال بڑی تھیں اور جلد ہی اس گھر سے رخصت ہونے والی تھیں۔

تقریب کا اِنتظام گھر پر ہی تھا۔ گھر کیا، سمجھیں محل تھا۔ خوب صورت سفید محل، اندر بڑا سا رالاؤنج، جو فینسی لائٹوں سے سجا ہوا تھا۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ آخر فرحان نے یہ پارٹی اپنے والد کے فائیو اِسٹار ریسٹورنٹ میں کیوں نہیں رکھوائی؟ اس کا جواب اس گھر کو دیکھ کر مل گیا تھا کہ گھر بھی کسی ریسٹورنٹ سے کم نہیں لگ رہا تھا، جہاں باوردی ویٹر، اِدھر اُدھر ٹرے میں مشروبات لیے گھوم رہے تھے۔

شاید سب کے لیے یہ ماحول عام سی بات ہو، لیکن میرے لیے بہت حیران کن تھا۔

''لگتا ہے تمھارے ڈیڈی نے ریسٹورنٹ کے تمام ملازمین کو بلوالیا ہے۔''
ایک دوست نے ہنستے ہوئے کہا۔
''نہیں، سارے نہیں، صرف صبح کی شفٹ کے ملازمین ہیں۔''
میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، جہاں ایک باوردی ویٹر سب کو اِشاروں سے یہاں وہاں بھیج رہا تھا۔ یقیناً یہ ویٹروں کا ہیڈ ہوگا، کیوں کہ اس کا لباس بھی اور ویٹروں سے الگ تھا۔ میں بے خیالی میں اسے دور سے دیکھ رہا تھا کہ مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ ابا تھے۔
ہاں ہاں، وہ.....ابا ہی تھے۔ میں اب پورا گھوم کر اُنھیں دیکھنے لگا۔
''کہاں گُم ہوگئے ہو؟ کسے دیکھ رہے ہو؟'' دوستوں نے ہنستے ہوئے کہا۔
میں گھبرا گیا اور پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر دم توڑ گئی۔
میں دوبارہ مڑ کر دیکھنے لگا۔ فرحان نے میری نظروں کے تعاقب میں دیکھا:
''ارے! تم بابو بھائی کو دیکھ رہے ہو؟ یہ ڈیڈی کے ریسٹورنٹ میں ہوتے ہیں۔ صبح کسی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ وہ جاب چھوٹ گئی تو ڈیڈ نے ڈرائیور رکھ لیا۔ شام پانچ بجے تک ڈیڈ کے آفس میں ہوتے ہیں، پھر شام کو ریسٹورنٹ آجاتے ہیں اور اَب تو ریسٹورنٹ میں بھی ڈبل شفٹ میں کام کر رہے ہیں۔
کہتے ہیں: بیٹے کو پڑھانا ہے، پڑھ لکھ کر وہ کہیں افسر لگ جائے۔
اب بتاؤ بھلا، جب ان لوگوں کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں تو کیوں اپنے بچوں کو پڑھا رہے ہیں اتنا، اپنے آپ کو مشقت میں ڈال کر۔''
فرحان کے ایک دوست نے ابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''نہیں بھائی! بابو بھائی کسی کی نہیں سنتے۔ ڈیڈی نے بھی بہت سمجھایا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ڈیڈی سے اُدھار لے کر گئے ہیں کہ بچے کی فیس بھرنی ہے۔''
میں تیزی سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میری کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔
''کہاں!؟'' فرحان نے میری طرف دیکھا۔
''میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ گھر جاؤں گا۔''
''ارے، کھانا تو کھالو۔''
''نہیں، پھر سہی، مجھ سے ویسے بھی کچھ نہیں کھایا جائے گا۔''
یہ کہہ کر میں ایک کنارے سے باہر نکل آیا کہ کہیں ابا نہ دیکھ لیں۔
اسکول کی میٹنگ میں ابا شروع شروع میں جاتے تھے، پھر امی ہی بہنوں کے ساتھ جانے لگی تھیں۔ شاید اِسی لیے فرحان نے ابا کو نہیں پہچانا اور نہ ہی کسی اور دوست نے۔
گیٹ سے باہر آکر میں تیز تیز چلتا رہا، مبادا کوئی دوست یا چوکی دار پیچھے سے آکر پکڑ نہ لے۔
میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔
پُرانی چیزوں کو کارآمد بنانے کی جدوجہد میں لگے ابا سامنے تھے۔
پرانی چپلوں کو مزید سلائی لگاتے ابا سامنے تھے۔
کھٹارا سائیکل کو غسل دیتے ابا سامنے تھے۔
میں دوست کے ساتھ بائیک پر یہاں آیا تھا، جس نے میرے گھر سے دو اِسٹاپ آگے سے مجھے بٹھایا تھا، جہاں میں گھر سے چنگ چی میں بیٹھ کر پہنچا تھا، کیوں کہ دوست کو اپنا گھر دِکھانے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔ اب جیسے تیسے گھر پہنچا، جوتے اُتار کر پلنگ پر رُخ دیوار کی طرف کر کے لیٹ گیا۔
''اوہو بھائی! بہت تھک گئے ہیں؟ بتائیں نا! وہاں کیا کیا کھایا؟ بہت سارے کھانے ہوں گے نا وہاں تو!'' چھوٹی بہن لہجے میں ہزاروں حسرتیں لیے اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔
میں اسے کیا جواب دیتا۔ میں نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں تھا سوائے ابا کے!
''تنگ نہیں کرو بیٹا! بھائی کو سونے دو، صبح پوچھ لینا۔''
مجھے بھلا نیند کیسے آتی؟ سب سو گئے اور میں جاگتا رہا، روتا رہا۔
صبح پانچ بجے کے قریب دروازے پر کھٹکا ہوا۔ میں بجلی کی تیزی سے اُٹھا۔ ابا دروازہ کھول کر اَبھی سائیکل اندر کر ہی رہے تھے کہ میں نے ان سے سائیکل لے لی۔
''لائیں ابا! میں اندر کردوں۔'' ابا نے حیرت سے مجھے دیکھا۔
''اُوراحیل! تُم ابھی تک جاگ رہے ہو؟''
سائیکل کھڑی کر کے جلدی سے ابا کا پلنگ بچھایا، تکیہ لا کر رکھا۔
''کیا ہوا راحیل! طبیعت ٹھیک ہے تمھاری؟''
''ہاں ابا! ابھی تو ٹھیک ہوئی ہے۔''
یہ کہا اور اُن کی ٹانگیں دبانے لگا۔ نجانے کتنی دیر تک کھڑا رہنا پڑا ہوگا!
اتنے میں فجر کی اذانیں شروع ہوگئیں۔ ''چل چھوڑ، فجر کا وقت ہوگیا ہے۔''
ابا کے ساتھ مسجد سے نماز پڑھ کر آیا۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر آج سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا۔
ابا تو اچھے تھے، میں ہی بُرا تھا جو اَبا کو پہچان نہ سکا۔ شاید سب باپ، اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی بنائے ہیں جو چپکے چپکے اپنے بچوں کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔

ماہ نامہ ذوق و شوق

محمد اسامہ سرسری۔ کراچی

لسانِ صدق و صفا ماہ نامہ ذوق و شوق
نشانِ رُشد و ہدیٰ ماہ نامہ ذوق و شوق

خدا کی حمد ہے ، نعتِ رسولِ احمد ہے
صدائے مدح و ثنا ماہ نامہ ذوق و شوق

سکھائے علم و عمل ، ذوق و شوق پھیلائے
بڑھائے فہم و ذکا ماہ نامہ ذوق و شوق

کمالِ نثر و ادب اور جمالِ نظم و غزل
نوالِ نور و ضیا ماہ نامہ ذوق و شوق

پہیلیاں ہیں ، لطیفے ہیں ، پیاری باتیں ہیں
ہے ذہنی نشو و نما ماہ نامہ ذوق و شوق

مزید سلسلے بھی ہیں مفید سب کے لیے
نویدِ صبح و مسا ماہ نامہ ذوق و شوق

نہ دیر کیجیے ، پڑھ لیجیے اسامہ! اب
بغیر چون و چرا ماہ نامہ ذوق و شوق

مشکل الفاظ و مرکبات اور ان کے مطالب:

۱۔ لسانِ صدق و صفا: سچائی اور خلوص کی زبان۔

۲۔ نشانِ رشد و ہُدیٰ: رہ نمائی پانے اور رہ نمائی کرنے کی علامت۔

۳۔ فہم و ذکا: سمجھ داری و عقل مندی۔

۴۔ نوالِ نور و ضیا: چمک دمک عطا کرنے والا۔

۵۔ نویدِ صبح و مسا: صبح و شام ملنے والی خوش خبری۔

۶۔ چون و چرا: بحث و مباحثہ

جھوٹوں کے جھوٹے ۹

۲۔ اسود عنسی

حافظ محمد دانش عارفین حیرت۔ لاہور

گدھے کو سدھانے کے لیے اس نے ایک لمبے عرصے تک لوگوں سے میل جول ترک کر رکھا تھا، لہٰذا اَب اس نے لوگوں سے ملنے جلنے کا فیصلہ کیا۔ لوگ ایک لمبے عرصے بعد اُس سے مل کر خوش ہوئے۔ وہ لوگوں کے درمیان پیش گوئیاں کرنے لگا۔ اس کی کہی ہوئی باتیں درست ثابت ہوتی تھیں۔ وہ اپنی باتوں کو اپنے شیطانی علم سے درست ثابت کرتا تھا۔ اس طرح اس کے قبیلے کے لوگوں میں اس کی شہرت عام ہوگئی۔ آہستہ آہستہ دوسرے قبیلوں کے لوگ بھی اس کے پاس آنے لگے اور اُس سے مستقبل کے بارے میں مختلف سوالات پوچھنے لگے۔ وہ لوگوں کو اُن کے سوالات کے جوابات دینے لگا۔ رفتہ رفتہ اسود عنسی نے محسوس کیا کہ صرف اس کے قبیلے کے لوگ ہی نہیں، دوسرے قبیلوں کے لوگ بھی اس کے عقیدت مند ہوگئے ہیں۔

اسود عنسی نے اپنا موازنہ نبی ﷺ سے کیا۔ چوں کہ نبوت کا اعلان کرنے سے پہلے آپ ﷺ کی مکہ مکرمہ میں بہت عزت تھی۔ لوگ آپ ﷺ کو صادق اور امین کے نام سے پکارتے تھے۔ ان سے اپنے فیصلے کرواتے تھے۔ ان کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے تھے۔

اسود کی بھی اپنے قبیلے کے لوگوں میں عزت بن گئی تھی۔ لوگ اس کے پاس ملنے کے لیے آنے لگے تھے، لہٰذا اَسود نے اپنی شان و شوکت کا موازنہ نبی ﷺ سے کرنے کے بعد سوچا کہ اب جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرنے کا صحیح وقت آچکا ہے۔

.....☆.....

اسود عنسی کو معلوم ہوا کہ نبی ﷺ نے اسلام کی دعوت سب سے پہلے اپنے قبیلے والوں کو دی تھی۔ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے اپنے گھر میں قبیلے کے لوگوں کو ایک دعوت پر بلایا اور اُن کے سامنے ایک خطبے میں اسلام کی دعوت دی تھی۔

اسود عنسی نے بھی اپنی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے کے لیے ایک دن اپنے قبیلے کے لوگوں کی دعوت کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس نے اپنے قبیلے کے معزز لوگوں کو دعوت بھیجی:

''فلاں روز آپ کی میرے گھر میں دعوت ہے۔''

''کیا تمھارے گھر ہماری دعوت ہے؟'' جسے بھی دعوت ملتی وہ حیران ہوکر یہ سوال پوچھتا۔

''جی ہاں، بالکل، میرے گھر آپ کی دعوت ہے۔'' اسود عنسی اپنے پرانے میٹھے انداز میں جواب دیتا۔

اسود عنسی کی طرف سے کھانے کی دعوت ملنے پر لوگ بہت زیادہ حیران ہوئے کہ کہاں تو کچھ عرصہ پہلے تک یہ آدمی کسی سے بھی نہیں ملتا تھا اور کہاں اب یہ ہم سب کو کھانے پر بلا رہا ہے۔ لوگ حیران تو ہوئے، مگر اُنھوں نے اس کی دعوت قبول کر لی۔

''ٹھیک ہے اسود! ہم تمھارے گھر دعوت پر ضرور تشریف لائیں گے۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' اسود دعوت قبول کرنے پر اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے واپس آ گیا۔

مقررہ دن اس کے قبیلے کے تمام معزز لوگ اس کے گھر اکٹھے ہو گئے۔ کھانے کے بعد ایک شخص نے پوچھا:

''بھئی اسود! ہمیں تم یہ تو بتا دو کہ آج کس خوشی میں ہماری دعوت کی گئی

ہے؟''

اس کی بات سن کر اَسود مسکراتے ہوئے کھڑا ہوا اور ایک خطبہ دیتے ہوئے ان سب کے سامنے مختصر الفاظ میں اپنی جھوٹی نبوت کا اعلان کیا:

''میں اللہ کا نبی ہوں۔ ویسے ہی جیسے مکے میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نبی ہیں۔''

اسود عنسی کا اعلانِ نبوت سن کر لوگ حیران رہ گئے۔ ایک آدمی نے اس سے پوچھا:

''ارے، ابھی چند دن پہلے ہی تو تم خود مسلمان ہوئے ہو، پھر تم کیسے نبی بن گئے؟''

اسود عنسی نہایت ہی چالاک اور عیار آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے، لہٰذا اُس نے اس سوال کا جواب پہلے ہی سوچ کر رکھا تھا۔ اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا:

''تم لوگ نہیں جانتے کہ مکے والے نبی کا انتقال ہو گیا ہے، لہٰذا نبوت میری طرف منتقل کر دی گئی ہے۔''

اس کا جواب سن کر لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ مزید کوئی شخص تسلی کے لیے کچھ پوچھتا، اسود نے کہا:

''یہ بہت اعلیٰ و اَرفع باتیں ہیں۔ بھلا تمھاری سمجھ میں کیسے آئیں گی۔ اس سے پہلے بھی تو تم لوگ میری باتیں سن کر حیران رہ جاتے تھے۔''

عنس قبیلہ ایک پسماندہ قبیلہ تھا اور یمن میں انتہائی دب کر رہتا تھا۔ اس قبیلے کا کسی دوسرے قبیلے پر زور نہیں چلتا تھا، لہٰذا جب اس قبیلے کے بزرگوں نے سنا کہ ان کے قبیلے میں ایک نبی آ گیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ان میں سے ایک شخص، جو تھوڑی بہت عقل کا مالک تھا، کہنے لگا:

''اسود! ہم تو تمھاری بات سن کر مطمئن ہو گئے ہیں، لیکن جب لوگ ہم سے تمھاری نبوت کی دلیل مانگیں گے تو ہم انھیں کیا جواب دیں گے۔ لوگ تو نبی کے معجزے دیکھ کر یا سُن کر ہی ایمان لاتے ہیں۔''

اسود عنسی تو پوری طرح تیار تھا۔ اس نے اتنے عرصے تک اسی مقصد کے لیے تو تیاری کی تھی، لہٰذا مسکرا کر کہنے لگا:

''ارے، بس اتنی سی بات؟ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ میں تمھیں اس قدر معجزات دکھاؤں گا کہ تم لوگ حیران رہ جاؤ گے۔''

پھر اپنے لہجے میں تھوڑی سی تلخی لا کر بولا:

''معجزات دیکھ کر اَب میری بلا سے تم کسی سے کچھ بھی کہو۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔''

کیوں کہ وہ لوگ اس وقت اسود عنسی کے گھر میں مہمان تھے، لہٰذا اپنے میزبان کو ناراض ہوتے دیکھ کر چاپلوسی کرنے لگے:

''ارے میاں! ہمیں معجزات کی کیا ضرورت ہے، ہم نے تو بس ایسے ہی بات کر دی تھی۔''

اسود عنسی معجزے دکھانے کا یہ موقع اپنے ہاتھ سے کیوں جانے دیتا۔ اس نے تو رات دن محنت کر کے ایک گدھا سدھایا ہی اس لیے تھا کہ وہ اس دن لوگوں کو اپنا گدھے والا معجزہ دکھا سکے۔ اس نے اپنے مہمانوں سے کہا:

''تم میں سے کوئی باہر جا کر صحن میں بندھے ہوئے گدھے کو تو لے آئے۔''

اس زمانے میں گدھا ہر گھر کی ضرورت تھا، سواری اور مال اٹھانے کے کام آتا تھا، چناں چہ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ ایک آدمی باہر گیا اور گدھے کو رسی سے پکڑ کر اَندر لے آیا۔

''لو، وہ گدھا آ گیا۔'' کسی نے اسود کو گدھے کی طرف متوجہ کیا۔

''تم میں سے کوئی شخص بھی اس گدھے پر اپنا حکم چلا سکتا ہے؟'' اسود عنسی نے اپنے مہمانوں سے گدھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

مہمانوں نے بے بسی سے جواب دیا:

''نہیں، ہم اس پر اَپنا حکم بالکل بھی نہیں چلا سکتے۔''

اپنے مہمانوں کا جواب سن کر اَسود عنسی نے عیاری سے کام لیتے ہوئے کہا:

''تم میں سے کوئی گدھے کو کچھ کہہ کر تو دیکھے، شاید گدھا اس کی بات مان لے۔''

اسود کی فرمائش پر اُس کا ایک مہمان آگے بڑھا اور گدھے کو پچکارنے لگا، مگر گدھے پر اُس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔

''اب تم لوگ دیکھو کہ یہ گدھا کیسے میری باتیں مانیں گا۔'' اسود نے اپنے مہمانوں سے پُر اِسرار انداز میں کہا۔ سب لوگ گدھے کی طرف متوجہ ہو گئے کہ کیسے یہ گدھا اس کی بات مانے گا۔

اسود عنسی نے گدھے کو اپنے مخصوص انداز میں حکم دیا:

''خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جا۔''

وہ ایک سدھایا ہوا گدھا تھا، لہٰذا فوراً سجدے میں چلا گیا۔ لوگ ایک گدھے کو سجدے میں جاتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''کیوں، دیکھا میرا معجزہ۔'' اسود نے لوگوں پر اپنی بڑائی بیان کرتی

شروع کی۔

''ہاں، واقعی یہ تو بہت حیران کن بات ہے۔ یہ یقیناً ایک معجزہ ہے۔'' اسود کے مہمان کہنے لگے۔

''اب اگر تم لوگ کہو تو میں اسے اٹھنے کا حکم دوں، کیوں کہ جب تک میں اسے اٹھنے کا نہیں کہوں گا، یہ واپس کھڑا نہیں ہوگا۔'' اسود عنسی نے لوگوں پر اپنی بڑائی مزید ظاہر کرنا چاہی۔

''ہاں ہاں، آپ اسے اٹھنے کا حکم دیں۔'' تمام مہمان یک زبان ہو کر بولے۔

''گدھے! اب اٹھ جاؤ۔'' اسود نے اپنے مخصوص انداز میں گدھے کو مخاطب کیا۔ گدھا فوراً اٹھ گیا۔ ان سادہ لوح لوگوں کے لیے یہ ایک خلافِ عقل بات تھی۔ وہ لوگ حیران ہو کر گدھے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اسود نے گدھے کو حکم دیا:

''گدھے! میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ اپنی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو جا۔''

وہ گدھا تو سدھایا ہوا تھا، لہٰذا فوراً اپنی دو ٹانگیں ہوا میں اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

یہ سب اس قدر اچانک ہوا تھا کہ اس کے قبیلے کے تمام لوگ ششدر رہ گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ شخص جب ایک جانور پر اِس طرح حکم چلا سکتا ہے تو ہمارے ساتھ کیا کچھ کر سکتا ہے۔

کھانا تو وہ لوگ پہلے ہی کھا چکے تھے، اس لیے اب انھیں وہاں سے نکلنے کی جلدی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد باہر جائیں اور جا کر لوگوں سے ان معجزات کے بارے میں بات چیت کریں۔ اسود بھی جانتا تھا کہ یہ لوگ باہر جانے کے لیے بے چین ہیں، لیکن وہ ایک چالاک شخص تھا، اس لیے اس نے لوگوں کو اپنی باتوں میں اُلجھائے رکھا اور اُن کی بے چینی کو بڑھاتا رہا۔

جب سب کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی تو اَسود نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کو مزید باتوں میں اُلجھا کر روکا نہیں جا سکتا، لہٰذا اُس نے اپنے مہمانوں کو مخاطب کیا:

''تم سب لوگ میرے قریبی ہو، اس لیے اب یہ تمھارا فرض بنتا ہے کہ ہمارے قبیلے اور دوسرے قبیلے کے لوگوں کو تم ہی میری نبوت کے بارے میں بتاؤ اور مطمئن کرو۔ اگر کوئی شخص تمھاری باتوں سے مطمئن نہ ہو اور مجھ سے ملنے کی ضد کرے تو تم لوگ اسے میرے پاس بغیر کسی جھجک کے لے آنا۔ میں اس آدمی کو خود ہی مطمئن کر لوں گا، مگر تم لوگ میرے معجزات کو دوسروں تک ضرور پہنچاؤ، تا کہ لوگ نجات حاصل کر سکیں اور اُنھیں نجات دلانے کا ثواب تم لوگوں کو حاصل ہو۔''

لوگ تو پہلے ہی اس کے گھر سے نکلنے کے لیے بے تاب تھے، اس لیے جیسے ہی اسود عنسی نے انھیں جانے کی اجازت دی وہ فوراً چلے گئے، تا کہ لوگوں کو اُس کے معجزات کے بارے میں بتا سکیں۔

ان لوگوں کے جاتے ہی اسود مسکرانے لگا اور آگے کے لیے لائحہ عمل طے کرنے لگا۔

.....☆.....

اپنے قبیلے کے لوگوں کی دعوت کرنے کے بعد اَسود عنسی نے اپنے چند قریبی اعتماد والے دوستوں کو بلوایا۔ انھیں اپنا گدھے والا معجزہ دکھا کر مزید متاثر کیا اور اُن سے کہنے لگا:

''تم لوگ ہر وقت یہاں موجود رہا کرو اور کسی کو بھی مجھ سے ملنے نہیں دیا کرو۔ کوئی بھی شخص اگر مجھ سے ملنے کے لیے آئے تو تم اسے کہہ دینا کہ میں عبادت میں مصروف ہوں۔''

اس فارغ وقت میں اسود نے اپنے شیطانی علم کے ذریعے سے کچھ شیطانی جن بھی اپنے قبضے میں کر لیے۔ وہ اسے اِدھر اُدھر کی خبریں لا کر دیتے، جس کی وجہ سے وہ لوگوں کو اپنی پیش گوئیاں سناتا۔ اس کے علاوہ وہ قرآن کی آیات جیسی وحی بنانے کی کوشش کرنے لگا، کیوں کہ ایک تو اُس کی زبان عربی تھی، اس لیے اس نے قرآن مجید بھی سیکھ لیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس وقت تک اس علاقے میں قرآن کے حافظ بھی نہیں پہنچے تھے۔ آپ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو بھی یمن کے شہر صنعاء میں قرآن کی تعلیم کے لیے بھیجا تھا، جو کہ اس وقت بہت دور تھا۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی مآرب میں قرآن کی تعلیم دے رہے تھے، اس لیے اسود عنسی کے علاقے کے لوگوں کو اِس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ وہ انھیں جھوٹی وحی بنا کر سناتا ہے۔

اسود عنسی کے قبیلے کا تعلق یمن کے ایک بڑے قبیلے مذحج کی ذیلی شاخ سے تھا۔ مذحج قبیلے کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ ان کے قبیلے کی ایک شاخ میں نبی ہے تو تمام شاخوں نے مل کر اَسود عنسی کی حمایت شروع کر دی۔ یوں اسود عنسی کو بہت بڑی افرادی قوت حاصل ہو گئی۔ اب وہ اپنی جھوٹی نبوت کو پھیلانے کے لیے جنگ کے ذریعے یمن کے علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، تا کہ وہاں پر اُس کی جھوٹی نبوت پھیل جائے۔

آپ ﷺ نے یمن کی حکومت باذان کی وفات کے بعد اُس کے بیٹے سمیت گیارہ افراد میں تقسیم کر دی تھی۔ ان دنوں آپ ﷺ کی طبیعت بہت خراب رہتی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پریشان تھے۔

اسود عنسی کو جب آپ ﷺ کی بیماری کی اطلاع ملی تو وہ مزید شیر

ہوگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اپنی طاقت پورے یمن میں پھیلا دے، کیوں کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تن درست ہوگئے تو وہ اس سے جنگ کے لیے لشکر روانہ کریں گے، لیکن اگر وہ دنیا سے پردہ فرما گئے تو پھر ایسے وقت میں ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے جنگ کریں گے، لہٰذا اُس نے فوراً ایک بڑی فوج تیار کرنے کا حکم دیا:

''جنگ کے لیے ایک فوج تیار کی جائے۔''

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی اور اُسے بتایا گیا: ''حضور! فوج تیار ہوگئی ہے۔''

''فوج کے ذریعے نجران پر حملہ کیا جائے۔'' اسود عنسی نے حکم دیا۔

فوج نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ یوں نجران اور اُس سے ملحقہ ریاستیں اسود عنسی کے قبضے میں آ گئیں۔

اسود عنسی کی فوج کے سپہ سالار کا نام قیس بن عبد یغوث مرادی تھا۔ یہ شخص بہت زبردست جنگ جُو اور اسود عنسی کا وزیر تھا۔ مراد کے علاقے پر فردہ بن مسیک کی حکومت تھی، لیکن چوں کہ یہ علاقہ قیس کا تھا، اس لیے بغیر جنگ کے یہ علاقہ بھی اسود عنسی کے قبضے میں آ گیا۔

صنعاء کا علاقہ، باذان کے بیٹے شہر بن باذان کے زیرِ حکومت تھا۔ اسود عنسی نے صنعاء پر فوج کشی کر کے قبضہ کیا اور شہر بن باذان جنگ میں بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ صنعاء میں لوگوں کو قرآن مجید کی تعلیم دے رہے تھے۔ انھوں نے جب جنگ کے حالات دیکھے تو صنعاء چھوڑ کر ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے علاقے مآرب کا رُخ کیا، مگر جلد ہی ان دونوں حضرات کو جنگ کی وجہ سے یہ علاقہ بھی چھوڑنا پڑا۔ رفتہ رفتہ اسود عنسی نے تقریباً پورے یمن پر قبضہ کر لیا۔

.....(جاری ہے).....

بقیہ: اُف یہ عینک

عینک کا تعارف حاصل کرنے کے لیے باری باری ہاتھوں میں لے کر اُس کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے ہاتھ پیر ٹیڑھے کر ڈالے۔ اماں جان کا خیال تھا کہ ابھی جتنے ستم اور باقی ہیں وہ بھی مکمل ہو جائیں تو ناقابلِ مرمت چشمے کی جگہ نیا چشمہ لے لیں گے۔ خدا خدا کر کے نسبتاً چھوٹے شیشوں کا نیا اور قیمتی چشمہ آ گیا۔

گھر کے سب لوگوں کا خیال تھا کہ یا تو چشمے کو ڈوری سے دور رکھا جائے یا بچوں کی پہنچ سے روشنی کو دور رکھا جائے۔ آخری تجویز ناممکن تھی، اسی لیے بے ڈوری چشمہ آ گیا اور پہلے ہی روز چار مرتبہ مختلف جگہوں پہ رکھ رکھ کر گم ہوتا رہا۔ بھیا اور سوہنی اسے ہر بار ڈھونڈ کر لاتے اور بھیا اعلان فرماتے:

''غائب کا چشمہ پھر غائب! اور ناظرین! بریکنگ نیوز! غائب کی غائب شدہ عینک بازیاب کرالی گئی ہے۔ محنتی کو کوئی انعام نہیں ملا۔''

ایک ہی دن میں شام کے وقت یہ پانچویں مرتبہ تھی کہ عینک پھر غائب تھی اور گھر کے تمام افراد اُسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تنگ آ چکے تھے۔

''بھیا!'' چپکے سے ہم نے بھیا کو مخاطب کیا تھا۔

''عینک ساز کمپنی کو ایک اور قیمتی مشورہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ وہ مختصر سی عینک میں ایک موبائل سسٹم بھی رکھیں۔ عینک گم ہو جائے تو اُسے مس کال دے کر آسانی سے تلاش کیا جا سکے۔ ہم نے تعریفی انداز سے سب گھر والوں کی طرف دیکھا اور سب نے اپنے سر پکڑ لیے۔

ہم کہتے ہیں: ''اُف یہ عینک!''

اور ہمارے اہلِ خانہ کہنے لگے:

''اُف! یہ روشنی بی بی!''

ذوقِ معلومات ۵۳ کا درست جواب

☆ ابو علی حسن ابن الہیثم

بچو! اس کا نام بتانا ۱ کا درست جواب

کوئل کوئل کوئل کوئل

بچّو! اُس کا نام ہے کوئل

ذوقِ معلومات ۵۴ کا درست جواب

☆ حضرت عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ

بچو! اس کا نام بتانا ۲ کا درست جواب

توتا توتا توتا توتا

بچو! اس کا نام ہے توتا

سوال آدھا جواب آدھا ۱۴

الطاف حسین۔ کراچی

اس کھیل میں چند جملے ہیں، ہر جملہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں کچھ معلومات دی گئی ہیں، جب کہ دوسرے حصے میں اسی طرح کی معلومات آپ سے پوچھی گئی ہیں۔ آپ مطلوبہ معلومات ہمیں ۳۰ نومبر تک ارسال کر دیجیے، ہم آپ کو اِس کا انعام روانہ کر دیں گے۔ ایک سے زیادہ درست جوابات موصول ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعے تین قارئین کرام کو انعام سے نوازا جائے گا۔ کوپن پُر کر کے ساتھ بھیجنا نہ بھولیے گا۔

❶ قرآن مجید میں نمازِ فجر کا ذکر سب سے پہلے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۷ میں آیا ہے..... بتایئے قرآن مجید میں نمازِ عصر (صلوٰۃ الوسطیٰ) کا ذکر سب سے پہلے کس سورت میں آیا ہے؟

❷ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے والدِ محترم کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام ہے..... آپ یہ بتایئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے والدِ محترم کا کیا نام ہے؟

❸ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت (23 جمادی الثانی 13 ہجری تا یکم محرام الحرام 24 ہجری) کے دوران میں بڑی فوج کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا تھا..... آپ یہ بتایئے کہ بحری فوج کا محکمہ کس اُموی خلیفہ کے دورِ خلافت میں قائم ہوا تھا؟

❹ عیسوی کلینڈر ''جنوری'' سے شروع ہوتا ہے..... بتایئے ہجری کلینڈر کا آغاز کس ماہ سے ہوتا ہے؟

❺ ''موریطانیہ اے موریطانیہ'' اسلامی جمہوریہ موریطانیہ کے قومی ترانے کا عنوان ہے..... بتایئے جمہوریہ لبنان کے قومی ترانے کا عنوان کیا ہے؟

❻ سوئٹزرلینڈ کی فضائی کمپنی کا نام ''سوئس ایئر'' ہے..... بتایئے نیدرلینڈ (سابقہ نام ہالینڈ) کی فضائی کمپنی کا کیا نام ہے؟

❼ ''صحرا چولستان'' پاکستان کے صوبہ پنجاب میں واقع ہے..... بتایئے ''صحرا سیہان'' پاکستان کے کس صوبے میں واقع ہے؟

❽ ''پھولوں اور بلبلوں کا شہر'' ایران کے شہر ''شیراز'' کو کہا جاتا ہے..... بتایئے ''سات پہاڑوں کا شہر'' اٹلی کے کس شہر کو کہتے ہیں؟

❾ وٹامن ''B1'' کی کمی سے بھوک کا کم ہو جانا اور نشوونما رُک جانے کے امراض لاحق ہو جاتے ہیں..... بتایئے وٹامن ''C'' کی کمی سے کون سا مرض لاحق ہو جاتا ہے؟

❿ ''آگے کنواں پیچھے کھائی'' اردو زبان کی ایک مشہور ضرب المثل ہے، جس کا مطلب ہے ''دونوں طرف سے خطرہ ہونا، یعنی کام کرنے میں بھی خرابی ہے اور نہ کرنے میں بھی خرابی''..... بتایئے ''آگے دوڑ پیچھے چھوڑ'' کا کیا مطلب ہے؟

آسیب میرے گھر میں

بلال ہاشمی۔ کراچی

''کیا بتاؤں قاسم! کیسی بہترین جگہ ملی ہے! بھائی! کھلا کھلا علاقہ ہے اور کچھ خالی میدان بھی ہیں۔ کچھ گھر ہیں جن میں برسوں سے کوئی نہیں رہ رہا۔ بس تمھارے بھائی کی ترقی کا سفر تو شروع ہو گیا۔''

فواد اور قاسم، دونوں گہرے دوست ہیں۔ فواد کا شوق اور مشغلہ کافی منفرد سا ہے۔ وہ کھنڈر نما پرانے گھر ڈھونڈتا پھرتا ہے اور جہاں کہیں کسی ایسی عمارت کی خبر ملتی ہے وہاں اپنا کیمرا لے کر پہنچ جاتا ہے، صرف اس امید پر کہ اسے کوئی بھوت، کوئی مخلوق نہیں تو کوئی سایہ تو دِکھ ہی جائے گا، جسے وہ دِکھا دِکھا کر لوگوں سے داد وصول کرے گا۔ ویسے اس شوق میں اس کی پُرتجسس طبیعت کو بہت دخل ہے اور یہ طبیعت اس نے ورثے میں اپنے ابا سے پائی ہے۔ اس کے ابا بچپن میں اس قسم کی حرکتیں کیا کرتے ہوں گے اور اَب فواد سمیت بہت سے لوگوں کو اپنے ''ایڈونچر'' خوب مزے لے لے کر سناتے ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ فواد اگرچہ یہ سمجھ چکا تھا کہ ان میں سے اکثر ایڈونچر معمولی سے واقعات ہوتے ہیں جنھیں والد محترم مرچ مسالا لگا لگا کر مجالس گرماتے ہیں، مگر اِس سننے سنانے سے فواد کے دل میں ایک شوق جڑ پکڑ گیا تھا۔ ایک تجسس اس کے دل و دماغ میں سما گیا کہ آخر ایسی جگہوں پر ایک پُراسرار خاموشی میں ہوتا کیا ہے۔ کیا برسوں تک ایسی جگہوں پر خاموشی اور ویرانی ہی رہتی ہے یا کوئی اور دنیا آباد ہے جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے؟ بس اس قسم کے سوالات کے جوابات کے لیے ہی فواد نے ایسی جگہوں پر چھاپے مارنے شروع کیے، مگر تا حال وہ کسی خاص کام یابی سے ہمکنار نہیں ہو سکا ہے۔

حال ہی میں فواد کے والد صاحب نے کراچی کے کنارے پر واقع ایک نئے پروجیکٹ میں گھر لیا ہے اور فواد کی خوش قسمتی کہ اس علاقے میں فواد کی من پسند ''ویرانی'' بہت وافر مقدار میں ہے۔ سونے پر سہاگا یہ کہ حال ہی میں اس نے اپنی دو سال کی عیدی اور کچھ اور جمع پونجی سے ایک آئی۔ آر۔ کیمرا لیا ہے اور یوں اس کی ''نگاہِ تجسس'' اور تیز ہو گئی ہے۔

گھر شفٹ کرنے کے ایک ہفتے بعد جب قاسم اس سے ملنے آیا تو فواد نے قاسم کو اِس نئی اور دل چسپ صورت حال سے آگاہ کیا۔

''تو اَب تمھارا کیا ارادہ ہے؟'' قاسم بھی بظاہر دل چسپی لیتے ہوئے بولا۔

''میں ایک کھنڈر نما عمارت دیکھ چکا ہوں، بس اب خاموشی سے اس میں اپنا کیمرا نصب کر آؤں گا اور پھر اگلے دن......''

قاسم نے فواد کی بات کاٹتے ہوئے فقرہ کسا:

''اور پھر اگلے دن تمھارا منہ کیمرے کی خالی فلم دیکھ کر ہمیشہ کی طرح لٹکا ہوا ہوگا۔''

''جلتے رہو۔ تم مانو یا نہ مانو، تمھارا بھائی اب اس شعبے میں ایک منفرد مقام حاصل کرنے والا ہے، چاہے تم جیسے حاسدین کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو!'' فواد نے بھی قاسم کو چوٹ کی۔

''جلے میری جوتی۔ ارے، میں تو چاہتا ہوں کہ میرے دوست کا نام روشن ہو۔'' فواد نے فوراً تائید کی۔

''ان شاء اللہ، ان شاء اللہ!''

''اور تمھیں زندگی میں بڑے بڑے بھوت اور دیو ملیں، پھر تم ایک چاندی سی چڑیل بیاہ کر گھر لے آؤ اور یوں زندگی ہمیشہ خوف ناک گزرے۔''

''مگر تم جیسا مزاحیہ بھوت ملنا بہت مشکل ہے۔''

فواد کی اس بات پر دونوں دوست ہنس پڑے، پھر کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے قاسم رخصت ہو گیا۔

فواد نے اپنے منصوبے کو حتمی شکل دینے کے لیے اپنا کیمرا تیار کرنا شروع کر دیا۔ کیمرے کے ڈبے میں رکھے کتابچے کو سرسری نظروں سے دیکھا۔ بظاہر کوئی ایسی بات نہیں تھی جو فواد کو پہلے سے پتا نہ ہو، سوائے آخر میں درج ایک ''وارننگ'' کے:

''اس کیمرے کو مافوق الفطرت عناصر کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ کسی بھی حادثے کی صورت میں کمپنی ذمے دار نہیں ہوگی۔''

''ہونہہ! کیمرے کو باکمال ظاہر کرنے کا ایک بازاری طریقہ۔'' فواد بڑبڑایا، مگر پھر ایک دم خیال آیا کہ اگر یہ بات واقعی درست ہو تو؟ کہیں

کوئی آسیب کیمرے سے ہوتا ہوا اُس کے گھر میں تو نہیں آجائے گا؟ ناممکن!'' فواد نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ ''مگر یہ تو ممکن ہے نا کہ کسی آسیب کی ایسی حقیقی تصویر آجائے جو ہوش اڑانے کے لیے کافی ہو؟ تو کیا! اچھا ہے میرا کام اور اعلیٰ معیار کا ہو جائے گا اور میری اور واہ واہ ہوگی۔''

اگلے دن کی عصر کا فواد بہت شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس عمارت میں مغرب سے پہلے ہی کیمرا نصب کر کے آجائے گا۔ اتنی ہمت تو اُس کے اندر بھی نہیں تھی کہ اندھیرے میں وہاں اکیلا رہے اور مصیبت یہ تھی کہ اس نئے علاقے میں ابھی اس کا کوئی ایسا دوست بھی نہیں بنا تھا جو ایسی خطرناک مہمات میں اس کا ساتھ دے سکے۔ بہرحال، شوق سے تو وہ باز آ نہیں سکتا تھا۔ اللہ اللہ کر کے عصر ہوئی اور عصر کے بعد وہ بھاگم بھاگ اپنا سامان اٹھا کر اُس کھنڈر کی طرف چلا۔ مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا وہ جب آخری گلی کے تیسرے مکان کے پاس سے گزرنے لگا تھا تو اُس نے محسوس کیا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ فواد نے بھی ادھر دیکھا تو اُس کے والد صاحب کے ہم عمر ایک صاحب جلدی سے باہر آتے دکھائی دیے۔ یہ ایک دبلے پتلے سے صاحب تھے اور پتا نہیں کیوں کچھ پُراسرار سے دِکھ رہے تھے۔ فواد کے لیے ابھی ان صاحب کی شخصیت کوئی اہم نہیں تھی، مگر شاید وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔

''بیٹا! بات سننا۔''

''جی فرمائیے!'' فواد مجبوراً رک گیا۔

''بیٹا! اگر..... اگر تم بھی اس کھنڈر کی طرف جا رہے ہو تو میری مانو، یہ ارادہ ترک کر دو۔''

فواد تقریباً اچھل پڑا۔ اول تو اُنھیں فواد کے عزائم کا اندازہ کیسے ہوا؟ پھر اِس کام سے روکنے کا کیا مقصد؟ چناں چہ فواد نے پوچھ ہی لیا:

''کیوں نہ جاؤں جناب!؟''

''بس مت جاؤ۔ مان جاؤ میری بات۔ وہاں ویرانی ہے، اندھیرا ہے۔ مت جاؤ، مت جاؤ۔''

یہ کہتے کہتے ان پُراسرار صاحب کی آنکھیں جیسے کسی تصور میں کھو گئیں اور وہ ''مت جاؤ، مت جاؤ۔'' والے جملے کو دُہراتے ہوئے واپس اپنے گھر میں چلے گئے۔

فواد ایک لمحے کے لیے تو وہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یہ سب کیوں کہہ رہے تھے۔ کہیں حقیقت میں تو اس کھنڈر میں کوئی خطرہ نہیں ہے؟ ایسا خطرہ جو اُس کی زندگی کا روگ بن جائے اور مشہور ناولوں کی طرح وہ کسی اَن دیکھی مخلوق کا شکار ہو جائے یا کچھ ایسا ہوتا ہو کہ اس کھنڈر میں جانے والے پھر واپس نہ آتے ہوں، مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ سب کہانیاں اور توہمات ہوں، جو لوگوں نے اس ٹوٹی پھوٹی عمارت سے وابستہ کر لی ہوں۔

''اوہو!'' فواد نے سر جھٹکا۔ ''میرے خیال میں انکل وہمی ہیں، خواہ مخواہ مجھے بھی پریشان کر رہے ہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ روشنی کا ہیولا سا کیمرے میں نظر آئے گا اور میں اس کی وڈیو لوگوں کو دکھاؤں گا اور داد وصول کروں گا۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

اب فواد کے قدم مزید تیز ہو گئے تھے اور اُس کی کوشش تھی کہ صرف وہ کھنڈر ہی اس کے قدموں کو روکے۔ کسی نصیحت، کسی خیال کی اب بالکل گنجائش نہیں تھی۔ جلد ہی وہ کھنڈر فواد کو قریب نظر آنے لگا۔ فواد کی خوشی اور شاید خوف میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ رہائشی علاقہ کافی پیچھے رہ گیا تھا اور جھاڑیوں اور خودرُو گھاس کا ایک مشکل راستہ شروع ہو چکا تھا۔ اس راستے میں جا بجا کیچڑ اور دلدل بھی تھی اور ماحول کو پُراسرار بنانے کے لیے آس پاس جھاڑیوں میں چھپے کیڑے مکوڑے بھی بھانت بھانت کی آوازیں نکال رہے تھے۔

فواد نے اپنے ڈرتے دل کو سمجھانے کے لیے سوچا کہ وہ اس ویرانی میں اکیلا نہیں ہے، یہ کیڑے مکوڑے بھی تو یہاں ہیں۔ اپنی اس سوچ پر فواد کو ہنسی آ گئی، مگر یہ ہنسی اس وقت فوراً غائب ہو گئی جب اس نے ایسا محسوس کیا کہ اس کھنڈر کی ایک کھڑکی سے ایک دم ایک روشنی اس کے چہرے پر پڑی ہے۔ فواد کا دل دھک دھک کرنے لگا، مگر دماغ نے ساتھ دیا تو سمجھ میں آیا کہ ہوا کے جھونکے سے اس کھنڈر کی ایک کھڑکی کا آدھا ٹوٹا شیشہ بند ہوا تو سورج کی روشنی کا عکس اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ اس خیال نے فواد کو سہارا دیا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آخر اُس کھنڈر کے قریب پہنچ گیا۔

اب فواد اور اُس کھنڈر کے درمیان صرف چند قدم کا فاصلہ تھا۔ فواد کو جتنی دعائیں یاد تھیں سب اس نے پڑھ لیں اور دروازے کی طرف بڑھا۔ وہاں باقاعدہ کوئی دروازہ تو نہیں تھا، البتہ ایک ٹوٹا ہوا پٹ سا تھا جو کسی مرحوم دروازے کی یاد دلا رہا تھا۔ فواد نے ڈرتے ڈرتے اسے ہلکا سا دھکا دیا تو وہ یک دم دھڑام کی آواز سے زمین بوس ہو گیا۔ اس دھڑام کی آواز سے اس عمارت میں ایک گونج سی پیدا ہوئی۔ اگرچہ ابھی مغرب کا وقت نہیں ہوا تھا، مگر کھنڈر کے اندر کافی اندھیرا تھا۔ فواد، اللہ کا نام لے کر آگے بڑھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ فواد اِتنا بہادر نہیں کہ ایسی خوف ناک عمارت کا بھرپور جائزہ لینے کی ہمت کر سکے، اس کا مقصد تو یہ تھا کہ بس کوئی مناسب سی جگہ دیکھ کر کیمرا نصب کر کے جلدی سے بھاگ آئے اور اگلے دن کیمرا واپس لے آئے۔ خیر، سرسری نظر سے تو ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں کیمرا رکھا جا سکے۔ فواد آگے بڑھا۔ یہ بظاہر اِس عمارت کا برآمدہ تھا جو اَب مٹی اور پتّوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس برآمدے کے چاروں طرف دیمک کے چاٹے ہوئے کچھ پورے اور کچھ آدھے دروازے نظر آ رہے تھے، جو شاید اِس گھر کے کمروں کے دروازے ہوں گے۔ برآمدہ کافی وسیع تھا، اس کے درمیان بل کھاتی سیڑھیوں کا ایک سلسلہ اوپر کی منزل کی طرف جا رہا تھا۔

''کیوں نہ کسی کمرے میں جا کر کیمرا لگاؤں؟'' فواد کو ایک خیال آیا۔

عین اسی لمحے ہوا کا ایک تیز جھونکا عمارت کے کھلے راستے کا فائدہ اٹھا کر اندر داخل ہوا اور فواد کے چہرے کو تھپتھپاتا ہوا کسی کمرے کی کھڑکی کے ایک پٹ سے ٹکرایا جس سے ایک زوردار آواز سے وہ پٹ کھل کر دیوار سے ٹکرایا۔ اب اندر کا منظر ایسا تھا کہ فواد کیا، کسی بھی سورما کا پتا پانی کرنے کے لیے کافی تھا۔ کمرے میں ایک سایہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا جو فواد سے بڑا ہی تھا۔ فواد کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ عمارت کے دروازے کی طرف دوڑا، مگر اَب وہ سایہ بھی بھاگ کر کمرے سے نکل کر برآمدے کی دیوار کے ساتھ بھاگتا ہوا فواد کے بالکل قریب آ گیا۔ فواد بدحواس ہو کر دروازے سے باہر نکل آیا۔ شکر ہے سورج اب تک وحشت کو کچھ کم کرنے کے لیے موجود تھا۔ پھر فواد دوڑتا ہوا اِس کھنڈر سے کچھ دور آ چکا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا اور دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اب فواد کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب اس نے محسوس کیا کہ وہ سایہ، ہاں ''اس کا اپنا سایہ'' بھی بھاگ کر اُس کے ساتھ اس کے قدموں سے لگ کر کسی پالتو جانور کی طرح کھڑا ہو گیا تھا۔ فواد کو جب ساری صورتِ حال سمجھ آئی تو وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو گیا۔

جب ہنسی اور سانس، دونوں قابو میں آئے تو اندازہ ہوا کہ اب مغرب کا وقت بہت قریب آ چکا ہے اور سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ فواد جلدی سے بھاگ کر دوبارہ اس کھنڈر میں داخل ہوا اور اِس دفعہ کافی خود اِعتمادی سے چلتا ہوا آگے بڑھا۔ برآمدے کے ایک طرف اسے دیوار میں ایک طاقچہ سا نظر آیا، جو شاید کسی زمانے میں چراغ رکھنے کے کام آتا ہوگا۔ فواد نے اپنا کیمرا آن کیا اور اُس کا ویو چیک کیا۔ حسبِ توقع کیمرا اندھیرے میں اپنا کمال دکھا رہا تھا۔ تقریباً ہر چیز انتہائی صاف اور واضح نظر آ رہی تھی۔ اطمینان کرنے کے بعد اُس نے کیمرا ایک جگہ پر رکھ دیا۔ کیمرے کی صحیح پوزیشن سیٹ کرنے میں تھوڑی سی مشکل ہوئی، کیوں کہ ایسی جگہ پر رکھنے کا تجربہ فواد کو پہلے نہیں ہوا تھا۔ بہرحال تھوڑی سی دِقت کے بعد کیمرا سیٹ ہو گیا، پھر فواد نے اس کیمرے سے منسلک اپنے موبائل کی اسکرین کو دیکھا تو مطلوبہ ویو بالکل صاف آ رہا تھا۔ فواد کو اطمینان ہوا اور وہ جلدی سے اس کھنڈر سے نکل آیا۔ اب مغرب کی اذانیں شروع ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں فواد اپنے گھر پہنچ گیا اور بے صبری سے امی ابو کے سونے کا انتظار کرنے لگا، تاکہ کمرے میں بیٹھ کر کیمرے کی کارروائی دیکھ سکے۔

اللہ اللہ کر کے یہ وقت کٹا۔ جب گیارہ بجے تو وہ اپنے کمرے میں آیا اور اِسکرین آن کی۔ فواد نے پہلے مغرب سے گیارہ بجے تک کی ریکارڈنگ تیز چلائی، مگر کچھ خاص نظر نہیں آیا۔ فواد اَب لائیو وڈیو

دیکھنے لگا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا اور گزر گیا۔ وہی کھلتے بند ہوتے کھڑکیوں کے پٹ، وہی پتوں کا ہوا کے دوش پر اُڑتے پھرنا۔ فواد کوشش کر کے اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، مگر سچی بات یہ ہے کہ بوریت نے نیند میں اور شدت پیدا کر دی تھی اور اَب اس کی آنکھیں بند ہونے ہی والی تھیں کہ اچانک کیمرے میں کچھ الگ سا نظر آیا۔ یہ وہ نہیں تھا جو فواد ڈیڑھ دو گھنٹے سے دیکھ رہا تھا، یہ کچھ اور تھا۔ فواد کی نیند یک دم غائب ہوگئی اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس نئی چیز کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ فواد نے پہلے تو سوچا کہ یہ بھی کسی دور سے گزرتی ہوئی گاڑی کی لائٹس کا عکس ہوگا، مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ ایک روشنی کا جسم تھا۔ پورا چمکتا ہوا، اس کے ہاتھ آگے پھیلے ہوئے تھے اور اُس کے قدموں کے آگے بڑھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بیمار یا انتہائی کمزور شخص کا ہوتا ہے۔

''یہ کیا ہے!؟'' فواد نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ فواد کے پسینے چھوٹنے لگے۔ یہ روشنی کا جسم آگے بڑھتا گیا اور اُس کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کھڑکیوں کے پٹ زور زور سے دیوار سے ٹکرانے لگے، پھر یہ دہشت ناک جسم برآمدے کی ایک جانب بڑھا۔

''کیا!؟'' فواد چونکا۔ ''کہیں یہ کیمرے کی طرف تو نہیں آ رہا؟ کیا یہ آسیب کیمرے کے ذریعے میرے گھر.....'' اب فواد بُری طرح کانپ رہا تھا اور اُس کے بعد جو ہوا وہ تو کسی بہادر سے بہادر شخص کے ہوش اڑا دینے کے لیے بھی کافی تھا۔ اس آسیب جسم نے اپنا ہاتھ کیمرے کی طرف بڑھانا شروع کر دیا اور پھر وہ ہاتھ اسکرین سے نکل کر.....

فواد چیخ مار کر خواب سے بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا، سب کچھ صحیح تھا۔ اس نے فوراً موبائل کی اسکرین کو دیکھا۔ وہی خالی کھنڈر، وہی پتے، وہی کھڑکی کھڑکیاں۔ یہ بے زار کن منظر اَب اسے بہت اچھا لگا۔ اس کے دل سے اللہ کا شکر نکلا۔ گھڑی کی طرف نظر دوڑائی تو تین بج رہے تھے۔

''گویا میں ایک گھنٹے سوتا رہا ہوں۔'' وہ بڑبڑایا۔ شکر ہے کمرا اچھی طرح بند تھا، یقیناً اس کی چیخ کمرے سے باہر نہیں گئی تھی۔ ویسے بھی تو اُس کا کمرا ایک کونے میں تھا۔ فواد شکر گزاری اور بے زاری کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ پھر لیٹ گیا اور اسکرین دیکھنے لگا، پھر کچھ دیر بعد نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلے دن چھٹی تھی۔ فواد فجر کے بعد جو سویا تو کافی دیر سے اٹھا۔ پچھلی رات کی پوری ریکارڈنگ کو تیزی سے چلایا، مگر کوئی قابلِ ذکر چیز محسوس نہ ہوئی۔ فواد کو رہ رہ کر اُن صاحب پر غصہ آ رہا تھا جنھوں نے اسے کھنڈر کے پاس جانے سے ایسے ڈرایا تھا جیسے وہاں ہر رات کو چڑیلوں کا میلہ لگتا ہو یا بد روحیں آتی ہوں۔ ''بس مت جاؤ۔ مان جاؤ میری بات۔ وہاں ویرانی ہے، اندھیرا ہے۔ مت جاؤ، مت جاؤ۔'' فواد اُنھی صاحب کے انداز میں ان کے جملے دہرانے لگا، پھر ہنس پڑا۔

ایک دم فواد کو ایک انوکھا سا خیال آیا: ''کیوں نہ میں اس منصوبے کو ختم کرنے سے پہلے اس کھنڈر کو دوبارہ دیکھ آؤں، شاید وہاں کوئی اہم بات محسوس ہو۔ آخر یہ بھی تو ضروری نہیں ہے نا کہ ہر چیز کیمرے میں ہی آجائے!'' فواد کو یہ خیال اچھا لگا، مگر رات والے خواب نے ایک دم جیسے اس کے قدم جکڑ لیے۔ اب اس کے ذہن میں دونوں طرح کے خیالات کی ایک جنگ سی شروع ہوگئی اور وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کرے۔ تجسس اسے جانے پر آمادہ کر رہا تھا، مگر ایک انجانا سا خوف اسے سختی سے روک رہا تھا۔ ابھی یہ کش مکش جاری تھی کہ اچانک اس کے والد صاحب ہاتھوں میں بہت ساری ایل۔ای۔ڈی۔ لائٹس لیے کمرے میں داخل ہوئے، جن کے بارے میں وہ پہلے بتا چکے تھے کہ بجلی جانے کی صورت میں جگہ جگہ روشن ہو کر بجلی کی کمی پوری کریں گی۔ والد صاحب بغیر تمہید کے ہی بول پڑے:

''ارے میرے ہیرو! کچھ پتا ہے، یہاں اس علاقے میں ایک کھنڈر ہے، وہاں رات کو پتا ہے کیا ہوتا ہے؟'' فواد یہ ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا کہ آج کل وہ وہاں کیا کر رہا ہے، چناں چہ انجان بنتے ہوئے بولا: ''بتائیے ابو! کیا ہوتا ہے؟''

''ارے، وہاں سے تو رات ہوتے ہی عجیب و غریب آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور ہاں، دیکھو تم وہاں جانے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے پتا ہے تمھیں ایسی جگہوں کے ''دورے'' کا خاص شوق ہے۔ ویسے بھی مجھے کام کے سلسلے میں آج رات کہیں جانا ہے، امی گھر پر اکیلی ہوں گی۔ ایسی کوئی حرکت نہ کرنا۔''

فواد نے کھوئے کھوئے انداز میں فرماں برداری کا مظاہرہ کیا اور اَب ایک نیا منصوبہ سوچنے لگا۔ فواد نے اٹھ کر فوراً قاسم کو کال کی۔ قاسم نے فون اٹھایا تو فواد نے ایک ہی سانس میں ساری رُوداد سُنا ڈالی۔ قاسم اطمینان سے سنتا رہا، پھر حسبِ عادت فواد کی امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے بولا:

''میرے بہادر دوست! یہ اور اِس جیسی باتیں کہانیوں میں ہوتی ہیں۔ میری مانو، شرافت سے کیمرا لے کر میرے ساتھ تین دن بعد بلوچستان کے ایک تفریحی دورے پر چلو اور اپنی کیمرا بازی کے جوہر وہاں دکھاؤ۔''

''یار! تم جیسے بزدل انسان کو بہادری کی کوئی بات بتانا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔''

''بھینس تو بین سن کر شاید کبھی زیادہ دودھ دے بھی دے۔'' قاسم

اپنے طنزیہ رویے میں دوبارہ بولا۔ ''مگر تمھاری یہ کوششیں تمھیں کبھی کوئی فائدہ نہیں دیں گی۔''

اب فواد کو غصہ آنے لگا، اس نے فوراً کال کاٹ دی۔ کال کاٹنے کے کافی دیر بعد تک قاسم کی کال آتی رہی، مگر فواد، قاسم سے بات ہی نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ ظہر میں تھوڑا سا ہی وقت رہ گیا تھا۔ فواد نے جیسے ہی ظہر کی نماز پڑھی اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اللہ کا نام لے کر پھر اُس کھنڈر کی طرف چلا۔ اب اسے ان پُراسرار صاحب کی ''بے تکی'' بات: ''بس مت جاؤ۔ مان جاؤ میری بات.....'' میں کچھ حقیقت نظر آرہی تھی جس کی وجہ سے عین دوپہر کے وقت بھی فواد کو خاصا خوف محسوس ہو رہا تھا، مگر وہ تیز تیز قدم بڑھاتا آخر پھر اُس کھنڈر میں پہنچ گیا۔

سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی خاموش پرانی عمارت، وہی ٹوٹے پھوٹے شیشوں والی کھڑکیاں اور وہی پُراسرار خاموشی۔ دروازہ تو پہلے سے ہی ٹوٹا ہوا تھا۔ فواد اندر داخل ہوا۔ اندر بھی کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ فواد نے ارادہ کیا کہ کیمرے کا ''زوم'' تھوڑا کم کردے، تاکہ پورے برآمدے کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا منظر اوپر والی منزل کا بھی آتا رہے۔ فواد نے آگے بڑھ کر کیمرے کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر..... کیمرا پہلے کے مقابلے میں اپنی جگہ سے کافی ہٹا ہوا تھا۔

''یہ کس نے کیا؟'' فواد نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ہوسکتا ہے، ہوا سے ہوا ہو، مگر ہوا زیادہ سے زیادہ کیمرے کو پیچھے گرا دیتی، اور ویسے بھی کل تو کوئی ایسی خاص ہوا تھی بھی نہیں۔'' فواد کو ایسا محسوس ہوا جیسے زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے ہیں اور عین دوپہر کے وقت بھی وہ خوف سے پسینے میں نہا گیا۔ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ فواد جب باہر کی طرف آیا تو اُس کے ہاتھوں کے توتے ہی اڑ گئے، کیوں کہ اس کی نظریں گرے ہوئے دروازے پر جم گئی تھیں، جس میں ایک پاؤں کا نشان تھا جو اُس کے اپنے پیر سے کافی بڑا تھا۔ یہ نشان لکڑی کے بوسیدہ ہونے کی وجہ سے اندر کو دھنسا ہوا تھا۔ اس نشان کو فواد نے آتے ہوئے جلدی میں محسوس نہیں کیا تھا۔ اب فواد کا اندیشہ جس سے وہ بار بار جان چھڑاتا آرہا تھا، اسے صحیح لگ رہا تھا۔

''تو کیا واقعی کسی مخلوق نے کیمرے میں گھسنے کی کوشش کی ہے؟'' اچانک فواد کو کیمرے کے کتابچے کی وارننگ یاد آئی:

''اس کیمرے کو مافوق الفطرت عناصر کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔''

اب اُن پراسرار صاحب کی تنبیہ بھی کانوں میں گونج رہی تھی:

''بس مت جاؤ۔ مان جاؤ میری بات۔ وہاں ویرانی ہے، اندھیرا ہے۔ مت جاؤ، مت جاؤ۔''

فواد کو یاد آیا کہ اس نے بڑوں سے سنا تھا کہ ہر خواب بے اصل نہیں ہوتا، بہت سے خواب سراپا حقیقت یا حقیقت کی طرف اشارہ ضرور کرتے ہیں۔ فواد نے اس سے پہلے بہت سی مہمات میں خوف محسوس کیا تھا، مگر شاید اس دوپہر جیسی خوف ناک دوپہر تو کیا، کوئی رات بھی اس نے نہیں دیکھی ہوگی۔ کیمرے کو جوں کا توں چھوڑ کر فواد اُلٹے قدموں سرپٹ دوڑتا ہوا گھر پہنچا اور بستر پر گر پڑا۔ کچھ دیر بعد اُسے اندازہ ہوا کہ اس کے والد صاحب گھر سے نکل رہے ہیں۔ فواد ایک دم اٹھا، تاکہ اپنے والد صاحب سے کچھ کہے، مگر پھر کچھ سوچ کر رُک گیا۔

''آخر ایک رات ہی کی تو بات ہے۔ ان شاءاللہ! کوئی حادثہ نہیں ہوگا، بس کچھ تھوڑا بہت نظر آئے گا اور کل صبح میں کیمرا واپس لے آؤں گا اور ایک اچھی وڈیو میرے ہاتھ آجائے گی، مگر کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ آسیب میرے گھر آجائے اور پھر.....

نہیں نہیں، میں منفی سوچوں گا تو کبھی کچھ نہیں کرسکوں گا۔''

یہ سوچ کر فواد نے زبردستی اپنا دھیان دوسرے کاموں میں لگایا اور آخر عشا کے بعد وہ وقت آ ہی گیا جب وہ اپنے کمرے میں دوبارہ اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا۔

''کیا آج کچھ ہونے والا ہے؟''

''کیا اس آسیب کو میرے آنے جانے کا علم ہے؟''

''کیا وہ میرے گھر آجائے گا؟''

یہ خیالات بار بار فواد کے ذہن میں آرہے تھے، جس سے اس کے تجسس میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور خوف میں بھی۔

اور پھر دس منٹ بعد، بیس منٹ بعد، ایک گھنٹے بعد بھی کچھ خاص نہیں ہوا، مگر فواد بہت پُرامید تھا کیوں کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کھنڈر میں کسی کے موجود ہونے کا پتا لگا چکا تھا، چناں چہ وہ مزید ایک گھنٹا ایسے ہی بیٹھا رہا، مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔

''اب ایک گھنٹا اور بیٹھوں گا، بس پھر میری ایسے سارے کاموں سے توبہ!''

فواد چڑ سا گیا تھا۔ فواد کو قاسم کا طنز یاد آنے لگا اور ساتھ ہی شدید غصہ بھی۔

''یہ دوست ہیں! شروع ہی سے مجھے اس کام سے بددِل کردیا۔''

ابھی بے زاری اور غصے کا یہ لاوا اُبل ہی رہا تھا کہ فواد کو اچانک ایک خیال آیا:

''میں نے آج صبح کی ریکارڈنگ نہیں دیکھی۔ کہیں اس وقت تو کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا؟''

''میں نے ساری رات کی ریکارڈنگ دیکھ لی تھی، مگر صبح جب میں سویا

ہوا تھا تو کیا ہوا ہوگا، یہ میں نے نہیں دیکھا۔''

یہ خیال آتے ہی فواد نے موبائل میں صبح کی ریکارڈنگ چلانے کا ارادہ کیا۔

ابھی وہ ریکارڈنگ چلا ہی رہا تھا کہ اچانک اسے براہ راست ویو میں دروازے سے کچھ اندر آتا دکھائی دیا۔

''کیا یہ بھی خواب ہے؟''

نہیں یہ حقیقت تھی۔فواد پورے ہوش وحواس کے ساتھ اس عجیب سے جسم کو اِس عمارت میں داخل ہوتا دیکھ رہا تھا۔وہ بظاہر تو ایک آدمی کے برابر ہی تھا، مگر اُس کے قدموں میں ایک ڈگمگاہٹ تھی۔فواد کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیلتی جارہی تھیں۔اس کے جسم سے جگہ جگہ سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔یہ کل والے خواب کے کتنے مشابہ تھا۔

''تو کیا وہ خواب سچ ہونے والا ہے؟ نہیں!'' اب فواد واقعی کانپ رہا تھا۔ شہرت، واہ واہ، کام یابی جیسے رنگین خیالات رخصت ہو چکے تھے اور اَب صرف خوف اور دہشت تھی۔فواد نے اپنی نظریں اسکرین سے ہٹانے کی کوشش کی، مگر اُسے لگا جیسے اسکرین نے اس کی آنکھیں مقناطیس کی طرح پکڑ لی ہوں۔

وہ خوف ناک روشنیوں والا جسم آگے بڑھتا جارہا تھا۔بڑھتا گیا، بڑھتا گیا اور پھر.....

وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔اب اس کا رُخ سیدھا کیمرے کی طرف تھا اور پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر کیمرے کی اسکرین پر رکھ دیا اور اُس کے ساتھ ہی فواد کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

جب فواد کو ہوش آیا تو اُس نے اپنے آس پاس اپنے امی ابو کو کھڑا دیکھا۔ امی اس کے سر پر پٹیاں رکھ رہی تھیں۔اس کا جسم بخار میں تپ رہا تھا۔

''مم.....مم..... میں کہاں ہوں؟ وہ آسیب گھر میں تو نہیں آ گیا؟ مجھے بتائیں کیا ہوا؟ مجھے بچائیں۔'' فواد عجیب سی کیفیت میں بولتا چلا گیا۔

''میرے لعل! سب صحیح ہے، سب اچھا ہے الحمدللہ! ہم گھر میں ہیں اور کوئی خوف کی بات یہاں نہیں ہے۔'' امی دلاسا دیتے ہوئے بولیں۔

فواد ابھی کچھ اور پوچھنے ہی والا تھا کہ امی، ابو سے مخاطب ہو کر بولیں:

''ارے بتائیے نا! خاموش کیوں ہیں؟ دیکھیں میرے بچے کو کیا ہوگیا!''

ابو کچھ شرمندہ سے نظر آرہے تھے۔بولے: ''بیٹا! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے افسوس ہے۔''

''کیسی غلطی؟ کیا ہوا، میں سمجھا نہیں۔'' فواد حیرت زدہ ہو کر بولا۔

امی بے صبری سے پھر بولیں:

''میں نے کہا ہے کہ پہیلیاں مت بجھوائیں، بے چارے کی حالت د ، سب سچ بتا دیں۔''

''ہاں ہاں، ابھی بتا دیتا ہوں۔ویسے مان لو، میں اداکار تو اچھا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ایک شرارتی سی مسکراہٹ ابو کے چہرے پر آ گئی۔

''بھئی بتا بھی چکیں۔'' اب امی جھنجھلا گئیں۔

''ہاں تو میرے ہیرو! میں آج کی اس مجلس میں یہ اعلان کرتا ہوں.....'' ابو اداکاری کرتے ہوئے بولے:

''کہ آسیب میں ہی ہوں۔''

''کیا!؟''

اب تو فواد اُچھل کر بیٹھ گیا، یعنی آسیب میرے گھر میں آ چکا ہے۔

''اور کیا، بل کہ تم سے پہلے اس گھر میں آیا تھا۔'' ابو اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولے۔

فواد حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔

''یعنی ساری شرارت آپ کی تھی؟''

''کیا کروں، تمھارا ہی باپ ہوں۔'' ابو مسکین سی صورت بنا کر بولے۔

''تو کل رات.....آپ ہی اس کھنڈر میں آئے تھے؟''

''ہاں ہاں، میں نے ساری رات قریبی ایک نئے دوست کے گھر گزاری ہے۔ ان کا آخری گلی میں تیسرا مکان ہے۔''

''اور وہ پُراسرار صاحب!'' فواد یک دم بولا۔

''صحیح نام لو۔پُراسرار صاحب نہیں، اسرار صاحب۔'' ابو چہرے پر مصنوعی غصہ لاتے ہوئے بولے۔''وہ بھی میری طرح کے شوق رکھنے والے ایک صاحبِ ذوق آدمی ہیں۔اور میں نے یہ سارا پلان تمھاری قاسم سے ہونے والی گفتگو سن کر ہی ترتیب دیا تھا۔ویسے وہ ایل۔ای۔ڈی۔لائٹس اندھیرے میں کیسی لگ رہی تھیں!''

ابو سینہ چوڑا کر کے فخر سے بول رہے تھے اور فواد پیچ وتاب کھا رہا تھا۔آخر جل کر بولا:

''تو اِس کا مطلب ہے، میری ساری وڈیو تو بے کار ہوگئی نا!''

''تو کیا ہوا؟ کہانی تو مزے دار بن گئی نا!''

''کہانی کا میں کیا کروں؟''

''کسی اچھے رسالے میں چھپوا دو۔''

ابو کی بات سن کر سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

مانی اور شانی نے عیادت کی

آمنہ خورشید۔ اسلام آباد

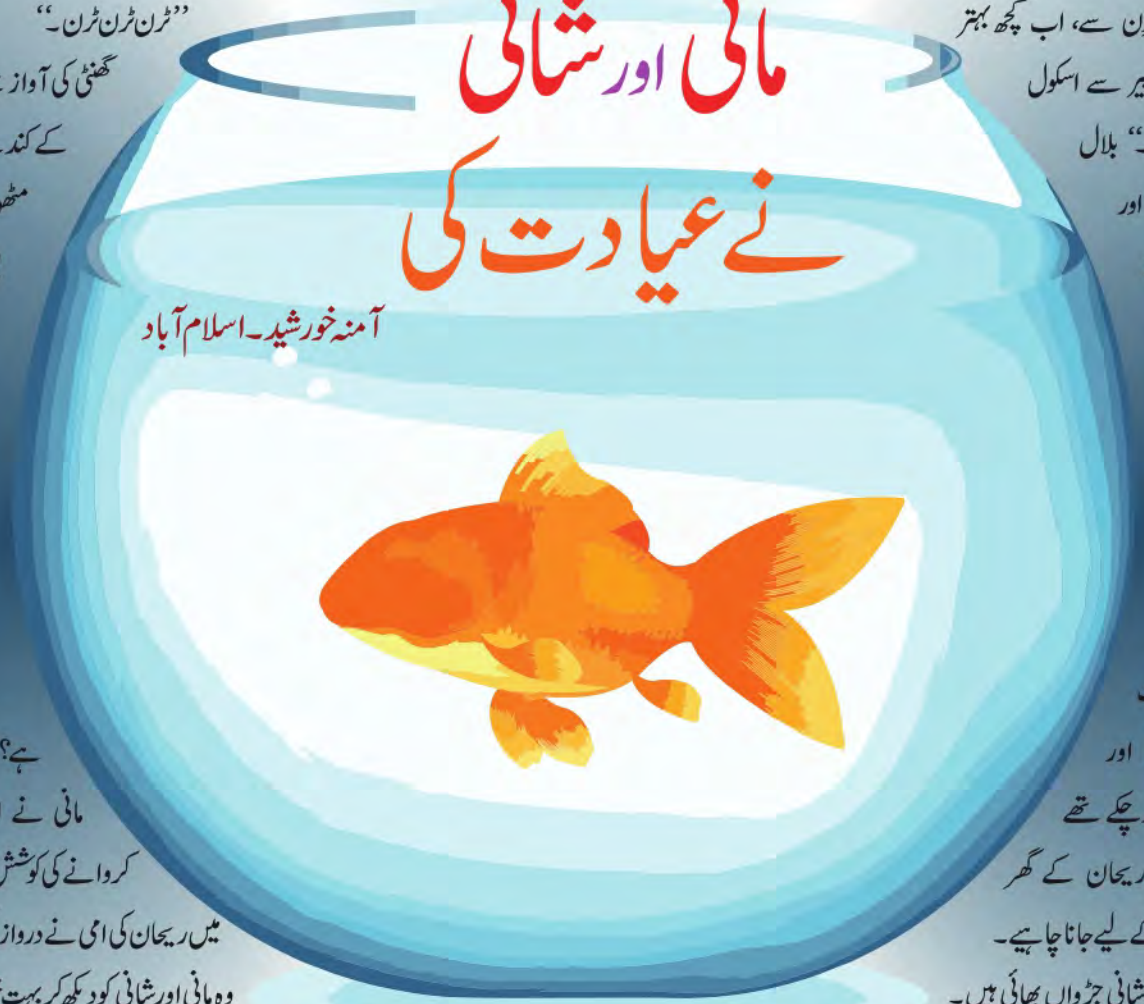

''آج پھر ریحان اسکول نہیں آیا، نہ جانے کیا بات ہے؟''

مانی نے شانی سے کہا۔ وہ لنچ کرنے کے بعد کمرۂ جماعت میں واپس جا رہے تھے۔ ریحان ان دونوں کا ہم جماعت اور گہرا دوست تھا۔

''ریحان؟ وہ تو بیمار ہے۔ بہت دنوں سے اسے تیز بخار ہے۔'' یہ بلال تھا، اس نے قریب سے گزرتے ہوئے مانی کی بات سن لی تھی۔ بلال ریحان کا پڑوسی تھا۔

''اوہ! کب سے؟'' دونوں کے منہ سے نکلا۔

''چار دِن سے، اب کچھ بہتر ہے۔ شاید پیر سے اسکول آنے لگے۔'' بلال نے بتایا اور اپنے نشست کی جانب بڑھ گیا۔

چھٹی کے وقت تک شانی اور مانی فیصلہ کر چکے تھے کہ انھیں ریحان کے گھر تیمارداری کے لیے جانا چاہیے۔

مانی اور شانی جڑواں بھائی ہیں۔ ان کی عمر دس سال ہے اور وہ چوتھی جماعت کے طالب علم ہیں۔

شام کو اُنھوں نے امی جان سے اجازت لی اور رِیحان کے گھر کی جانب چل دیے۔ ان کا پالتو توتا مٹھو ہمیشہ کی طرح ان کے ساتھ تھا۔ وہ باتیں کرنے والا توتا ہے اور خوب باتیں کرتا ہے۔ امی نے انھیں پھلوں کا ایک تھیلا بھی دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب کسی بیمار کے گھر اُس کا حال پوچھنے جائیں تو کبھی خالی ہاتھ نہ جائیں۔ راستے بھر مٹھو کی کوشش رہی کہ کسی طرح امرود سے بھرے تھیلے پر ایک آدھ چونگ تو مار ہی لی جائے۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ امی جان نے مانی اور شانی کو منع کیا تھا کہ مٹھو کو ساتھ نہ لے کر جائیں، لیکن مانی شانی کی یہ پرانی عادت ہے کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں مٹھو ہمیشہ ہی ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ سو آج بھی ایسا ہی تھا۔

ریحان کا گھر تین گلیاں چھوڑ کر آخری گلی میں واقع ہے۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر شانی نے اچک کر گھنٹی بجائی۔

''ٹرن ٹرن ٹرن۔''

گھنٹی کی آواز سنتے ہی مانی کے کندھے پر بیٹھا مٹھو ایک دم بولنے لگا:

''کون ہے؟ کون ہے؟ کون ہے؟''

مانی نے اسے چپ کروانے کی کوشش کی۔ اتنے میں ریحان کی امی نے دروازہ کھول دیا۔ وہ مانی اور شانی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور اُنھیں اندر لے گئیں۔

آنٹی انھیں ریحان کے کمرے میں لے آئیں۔ ریحان ابھی سو کر اُٹھا ہے اور اَب کافی بہتر لگ رہا ہے۔

''کیسے ہو ریحان!؟ ہم پریشان ہو گئے تھے تمھاری بیماری کا سُن کر۔'' مانی نے کہا تو شانی نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

''سر سلیمان بھی تمھارا پوچھ رہے تھے۔'' شانی نے بتایا تو ریحان اداس سا ہو گیا۔ سر سلیمان ریاضی کے استاد تھے اور رِیاضی، ریحان کا

پسندیدہ مضمون تھا۔

''ہاں، بس میں جلد ہی اسکول آؤں گا۔'' اس نے کہا تو مانی شانی ایک ساتھ بولے:

''ان شاءاللہ!''

ابھی مانی اور شانی، ریحان کو ہفتۂ کھیل کے بارے میں بتا رہے تھے کہ مٹھو شانی کے کندھے سے اُڑ کر الماری پر رکھے ایک مرتبان پر جا بیٹھا۔ یہ گول مٹول سا شیشے کا مرتبان تھا جس میں ایک پیاری اور ننھی سی سرخ مچھلی تیر رہی تھی۔ کبھی وہ دائیں جانب تیرتی، کبھی بائیں جانب اور کبھی تیزی سے اوپر کی طرف آتی۔ جیسے ہی مٹھو مرتبان کے کنارے آ کر بیٹھا مچھلی پریشانی سے رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

شانی اور مانی ہاتھ کے اشارے سے مٹھو کو واپس بلا رہے تھے۔ جب الماری اونچی ہونے کے باعث ان کا ہاتھ مٹھو تک نہیں پہنچ پایا تو وہ ساتھ ہی ساتھ چلانے بھی لگے:

''مٹھو! واپس آؤ۔ مٹھو! نہیں، مٹھو! واپس آؤ، مٹھو! ادھر آؤ!''

ریحان بھی گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس نے امی کو بلایا:

''امی! امی!''

اس شور شرابے سے گھبرا کر مٹھو نے اڑنا چاہا تو اُس کا پاؤں پھسلا اور مرتبان لڑھک گیا۔ مچھلی نیچے جا گری اور پانی شڑاب کی آواز کے ساتھ فرش پر پھیل گیا۔ مچھلی بُری طرح تڑپنے لگی تو ریحان بستر سے نکل کر اُسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ جیسے ہی وہ مچھلی کے قریب آیا پانی کی وجہ سے اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ گر گیا۔

''آاا! آہ!'' ریحان کا سر کرسی سے ٹکرایا۔ مانی اور شانی، جو ابھی تک مٹھو کو پکڑنے کی کوشش میں مصروف تھے، ریحان کی چیخ سن کر فوراً اُس کے پاس آئے اور اُسے اٹھانے لگے۔

ریحان کی امی بریانی کو دَم لگا کر کمرے میں آئیں تو کمرے میں پھیلی اس ہڑبونگ کو دیکھ کر حیران رہ گئیں، پھر وہ ساری صورتِ حال سمجھ گئیں۔ انھوں نے جلدی سے مرتبان کو سیدھا کر کے مچھلی کو مرتبان میں واپس ڈالا اور ہاتھ میں پکڑے پانی کے جگ سے مزید پانی مرتبان میں ڈال دیا۔ بے چاری مچھلی اس ساری مصیبت سے ہلکان ہو گئی۔

اتنے میں مانی اور شانی نے ریحان کو اُٹھا کر بستر پر لٹایا۔ اس کی پیشانی پر نیل پڑ گیا۔ آنٹی نے پہلے مانی اور شانی اور پھر مٹھو کو دیکھا، جو اِس سب سے بے نیاز کھڑکی میں بیٹھا جامن کے درخت کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

جب آنٹی ریحان کی پیشانی پر مرہم لگا چکیں تو اُنھوں نے بہت پیار سے کہا:

''پیارے بچو! آپ کو مٹھو کو ساتھ لے کر نہیں آنا چاہیے تھا۔''

مانی اور شانی خاموش تھے۔ مارے شرمندگی کے انھیں کوئی جواب نہ سوجھا۔

آنٹی مسکرائیں اور کہنے لگیں:

''اچھا چلو، آپ لوگ باتیں کرو۔ میں جوس لے کر آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئیں۔

مانی نے شانی کو دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ باتیں کیں، پھر ریحان سے کہنے لگے:

''ریحان یار! سوری! ہماری وجہ سے تمھیں تکلیف ہوئی۔''

''کوئی بات نہیں۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ مانی! پلیز، مجھے پانی لا دو۔'' ریحان نے کہا تو مانی فوراً کھڑا ہو گیا۔

''ہاں ہاں، ابھی لاتا ہوں۔''

وہ باورچی خانے میں گیا تو آنٹی وہاں نہیں ہیں۔ اس نے فریج کھولا تو سامنے گلاس میں انار کا جوس رکھا ہے۔ مانی نے سوچا: پانی سے تو اچھا ہے ریحان کو اَنار کا جوس پینا چاہیے۔ امی کہتی ہیں: اس سے خون بنتا ہے اور جسم میں طاقت آتی ہے۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ریحان کے کمرے میں چلا آیا۔

''ارے! انار کا جوس۔ میرا پسندیدہ جوس!'' ریحان نے کہا اور گلاس لے کر غٹا غٹ پینے لگا۔ مانی نے فخریہ نظروں سے شانی کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو: دیکھا، یوں خدمت کرتے ہیں اور تم سے ایک تو تانہیں پکڑا گیا۔

باتوں کے دوران میں اچانک شانی کو یاد آیا۔

''ارے ریحان! پیر کو اُردو کا ٹیسٹ ہے، باب نمبر تین آئے گا۔ سر مبین نے سختی سے کہا ہے کہ کسی کے نمبر کم نہیں آنے چاہییں۔''

''اوہ..... اوہ! میں تو اسکول گیا ہی نہیں چار دِن سے۔ میرے پاس باب تین کے نوٹس نہیں ہیں۔ اب میں کیا کروں گا۔ سر مبین تو اِتنا ڈانٹتے ہیں!'' ریحان یہ کہتا کہتا روہانسا ہو گیا۔

''ہمم! کوئی بات نہیں، تم بتا دینا کہ تم بیمار تھے۔'' شانی نے اسے تسلی دی، لیکن ریحان مزید پریشان ہو گیا۔

''نہیں، سر کسی کی بات نہیں سنتے۔'' وہ سر مبین کی ڈانٹ کا سوچ کر ہی

رونے لگا۔اب اسے گلے میں بے تحاشا درد بھی محسوس ہو رہا ہے۔

آنٹی جب سوپ لے کر کمرے میں داخل ہوئیں تو ریحان کا رُو رُو کر بُرا حال ہے اور مانی اور شانی اس کے دائیں بائیں بیٹھے اسے چپ کروانے میں مصروف ہیں۔

''ارے کیا ہوا بیٹا!؟'' ریحان کی امی ٹرے میز پر رکھ کر فوراً مسہری پر بیٹھ گئیں اور ریحان کو پیار کرنے لگیں۔ ریحان نے رونا بند کر دیا اور بتایا:

''امی! پیر کو ٹیسٹ ہے اور میری تو تیاری ہی نہیں ہے۔''

''تو کوئی بات نہیں بیٹا! آپ کے ابو آپ کے چلے ساتھ جائیں گے اور سارے استادوں سے مل کر آجائیں گے۔'' امی نے کہا تو ریحان کو تسلی ہوگئی۔ سوپ پلا کر امی نے ریحان کو دوا کھلائی، پھر لٹا دیا۔ شانی اور مانی بھی ریحان اور اُس کی امی کو خدا حافظ کہہ کر اپنے گھر آگئے ہیں۔

.....☆.....

جب وہ گھر پہنچے تو دادو اُن کا انتظار کر رہی تھیں۔

''آ گئے میرے بچے! کہاں گئے تھے؟ میں کب سے تمھارے لیے بادام کا حلوہ لیے بیٹھی ہوں۔'' دادو نے پیار سے کہا اور اُن کے لیے حلوہ نکالنے لگیں۔

''دادو! ہم اپنے دوست ریحان کے گھر گئے تھے۔ وہ بیمار ہے نا! ہم اس کا حال پوچھنے گئے تھے۔'' مانی نے بتایا۔

''اچھا پھر؟ اس کی طبیعت کیسی ہے اب؟'' دادو نے پوچھا۔

''دادو! اب وہ ٹھیک ہے، لیکن..... مٹھو کی وجہ سے..... وہ.....'' شانی نے بتانا چاہا تو مانی اشارے کرنے لگا:

''نا، نا نہیں بتانا۔''

لیکن مانی کے پیٹ میں مشکل سے ہی کوئی بات ٹک پاتی ہے۔ اس نے دادو کو وہاں کی پوری روداد سنا دی۔

''ہمم! تو یہ بات ہے۔'' دادو نے ہنکارا بھرا، پھر کہنے لگیں:

''بیٹا! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ لوگوں کو مٹھو کو ساتھ لے کر نہیں جانا چاہیے تھا۔''

''دادو! میں نے اسے کہا تھا، لیکن یہ نہیں مانا۔'' شانی نے مانی پر الزام لگایا۔

''جی نہیں، میں نے کہا تھا کہ مٹھو کو ساتھ نہیں لے کر جاتے، لیکن تم نہیں مانے۔'' مانی کہاں پیچھے رہتا۔

''اچھا بس، اب آپ لڑائی نہ کریں، بل کہ میری بات غور سے سنیں۔

جب بھی ہم کسی بیمار کے گھر اُس کا حال چال پوچھنے جائیں تو ہمیں اپنے پالتو جانور یا پرندوں کو ساتھ لے کر نہیں جانا چاہیے۔ بھلا ایک پرندے کو کہاں سمجھ ہو سکتی ہے۔

اور بیمار اِنسان کی جتنی ہو سکے خدمت کرنی چاہیے۔ مانی! آپ نے مدد تو کی، لیکن آپ نے ریحان کو اَنار کا جوس پلا دیا، جس سے اس کے گلے میں دوبارہ درد ہونا شروع ہو گیا۔'' مانی نے یہ سنا تو شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ اس لحاظ سے تو اُس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ دادو کہہ رہی تھیں:

''پھر آپ لوگوں نے اسے ٹیسٹ کے بارے میں بتا کر پریشان کر دیا۔ ایسے نہیں کرتے۔ بیمار لوگ پہلے ہی حساس ہو جاتے ہیں، ہمیں ان کا دل خوش کرنا چاہیے اور اُنھیں تسلی دینی چاہیے۔ پیارے نبی پاک ﷺ نے ہمیں یہی بات سکھائی ہے کہ جب ہم عیادت کرنے جائیں تو مریض سے کہیں:

لَا بَأْسَ، طَهُورٌ إِنْ شَاءَ اللهُ!

(کوئی بات نہیں، یہ بیماری تو تمھیں (گناہوں سے) پاک کرنے والی ہے۔)

ٹھیک ہے، میرے بچو!؟'' دادو نے پوچھا تو مانی اور شانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے!'' یہ مٹھو تھا۔ وہ بھی غور سے دادو کی باتیں سن رہا تھا۔

دادی جان نے مٹھو کے پنجرے میں تھوڑا سا حلوہ رکھا اور کمرے میں چلی گئیں۔ مانی اور شانی بھی سونے چلے گئے۔

ایک سوال، ایک تحفہ ⓬ کا درست جواب

☆ سفر جل

ہری پیاز

سعد علی چھیپا۔ کراچی

ہری پیاز پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی کاشت کی جاتی ہے۔اس پیاز کے ساتھ پتے بھی ہوتے ہیں۔ یوں تو ہر پتے والی سبزی کے بے شمار فائدے ہیں اور اُس میں موجود اجزا ہماری صحت کو برقرار رکھنے میں ایک بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ پتے والی سبزیاں نہ صرف غذائیت سے بھرپور ہوتی ہیں، بل کہ یہ صحت کی ضامن بھی ہیں۔

پتوں والی سبزیاں ہمارے منہ کی بدبو کو دور کرنے کے لیے مفید ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ دانتوں کی صفائی بھی ہو جاتی ہے۔سبز پتوں والی سبزی سے آنکھوں کی روشنی بھی تیز ہوتی ہے اور آنکھوں میں موتیا کی شکایت سے بچا جا سکتا ہے۔ ہری پیاز میں کاربو ہائیڈریٹس، وٹامن۔سی، پروٹین، آئرن، فاسفورس، سلفر اور کیلشیم پایا جاتا ہے۔ ہری پیاز میں بھی وہ تمام اجزا شامل ہیں جو ہمارے جسم کو توانا رکھنے میں مددگار ہے۔

ہری پیاز کے فوائد:

☆ منہ کی بدبو کو دور کرتی ہے۔
☆ قبض سے نجات ملتی ہے۔
☆ تیزابیت کا خاتمہ ہوتا ہے۔
☆ غذا کو زود ہضم بناتی ہے۔
☆ ہیضہ سے محفوظ رکھتی ہے۔
☆ کولیسٹرول کو نارمل رکھنے میں مدد کرتی ہے۔
☆ جوڑوں کے درد میں آرام پہنچاتی ہے۔
☆ نزلہ زکام سے محفوظ رکھتی ہے۔
☆ کھانسی اور حلق کی بیماریوں سے بچاتی ہے۔
☆ جگر کے لیے بھی فائدہ مند ہے۔
☆ داغ، دھبوں اور دانوں سے محفوظ رکھتی ہے۔
☆ معدے کی جلن سے آرام ملتا ہے۔
☆ دل کے امراض سے بچا جا سکتا ہے۔
☆ آنکھوں کے لیے بھی مفید ہے۔
☆ مثانے کی سوزش سے بچاتی ہے۔
☆ ہر طرح کی موسمی بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے۔
☆ پھیپھڑوں کو صحت مند بناتی ہے۔
☆ بلڈ شوگر میں کمی لاتی ہے۔
☆ بڑی آنت کے سرطان سے محفوظ رکھتی ہے۔
☆ ہڈیوں کو مضبوط بناتی ہے۔
☆ بھوک کی کمی کو دور کرتی ہے۔
☆ تھکاوٹ دور کرتی ہے۔
☆ دماغی سکون پہنچاتی ہے۔

تمام قارئین کرام سے مؤدبانہ عرض ہے کہ کسی بھی سبزی کے فوائد پڑھ کر اسے زیادہ نہ کھائیں، بل کہ اس کا استعمال اعتدال سے کریں اور اگر آپ کو کوئی خاص بیماری ہے تو اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کر کے کوئی بھی سبزی استعمال کریں۔

ترے سوفے ہیں افرنگی ، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

تنویر احمد ایک کاروباری آدمی تھے۔ اُن کی گارمنٹس کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی، جسے اُنھوں نے برسوں کی محنت سے اس قابل بنایا تھا کہ وہ انھیں اچھا منافع دے رہی تھی۔ زندگی کی بہت سی سہولیات میّسر آنے کی وجہ سے تنویر احمد خدائے بزرگ و برتر کے بے حد شکر گزار تھے۔

چند برس قبل جب وہ اپنے نئے اور خوب صورت گھر میں منتقل ہوئے تو اُنھوں نے نہ صرف شکرانے کے نفل ادا کیے، بل کہ غریبوں اور مسکینوں میں دیگیں پکوا کر بھی تقسیم کیں۔ وہ اپنی بیوی سلمٰی بیگم اور تین بچوں ارشد، نائلہ اور ریحان کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے، لیکن وقت ایک سا نہیں رہتا اور خوشیوں کے ساتھ ساتھ دُکھ اور پریشانیاں بھی انسانی زندگی میں آتے رہتے ہیں، لہٰذا تنویر احمد بھی مشکل حالات کا شکار ہو گئے۔

اقبال کا شاہین

محمد نوید مرزا۔ لاہور

ایک شام جب وہ گھر واپس آئے تو اُن کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ اُن کی بیگم سلمٰی نے جب اُن کی اُڑی ہوئی رنگت دیکھی تو اُنھوں نے اپنے شوہر سے ان کی پریشانی کے بارے میں پوچھا تو اُنھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پریشانی نہیں ہے، اس کام کی وجہ سے خاصی تھکن محسوس کر رہا ہوں، لیکن کچھ دنوں بعد جب سلمٰی بیگم نے تنویر احمد جیسے خوش باش انسان کو اِضطراب اور تناؤ کی ملی جُلی کیفیت میں مبتلا دیکھا تو اُن سے رہا نہ گیا اور وہ اس کی وجہ جاننے کے لیے اصرار کرنے لگیں، جس پر تنویر احمد نے دل شکستہ لہجے میں اُنھیں بتایا کہ آج کل ہماری فیکٹری میں بننے والی مصنوعات کی مانگ کم ہوگئی ہے، کیوں کہ ہمارے مقابلے میں ایک بڑا سرمایہ دار اپنی سستی چیزیں مارکیٹ میں لے آیا ہے، حالاں کہ ہمارا معیار اُس سے بہتر ہے اور ہم خصوصاً بچوں کے ملبوسات میں نت نئے ڈیزائن بھی متعارف کروا چکے ہیں، مگر کم قیمت ہونے کی وجہ سے بازار میں اُس کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے اور یہ بات میرے لیے پریشانی کا باعث ہے۔

بہر حال خدا پر بھروسا رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر تنویر احمد تو خاموش ہو گئے، مگر سلمٰی بیگم تشویش میں مبتلا ہو گئیں۔

اگلی شام جب تنویر احمد گھر آئے تو اُن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ بیگم کے پوچھنے پر اُنھوں نے بتایا کہ پرسوں مزدوروں کی مہینے کی تنخواہ کی ادائیگی کرنی ہے اور فیکٹری کے اکاؤنٹ میں رقم بہت کم ہے۔ اگر اُنھیں بروقت تنخواہ نہ ملی تو وہ غریب لوگ کیا کریں گے؟ پھر یہ میری عزت کا بھی معاملہ ہے۔ یہ کہہ کر فکر میں ڈوبے ہوئے تنویر احمد اپنے کمرے میں چلے گئے۔ رات کا کھانا بھی انھوں نے بہت کم کھایا اور بیوی بچوں سے بھی کوئی بات نہیں کی۔ رات بے چینی کے عالم میں وہ اپنے کمرے میں ٹہلتے رہے۔ تقریباً دو بجے انھوں نے اپنی بیوی سلمٰی بیگم کو یہ کہہ کر جگایا کہ اُن کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔

سلمٰی بیگم آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھیں اور فکر مندی سے تنویر احمد کی طرف دیکھا تو اُن کا چہرہ سیاہ پڑ رہا تھا۔ سلمٰی بیگم نے فوری طور پر اپنے بیٹے ارشد کو جگایا کہ وہ ڈرائیور کو اُٹھائے۔ تھوڑی ہی دیر میں سلمٰی بیگم ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر تنویر احمد کو قریبی ہسپتال لے جا چکی تھیں۔ ابتدائی طبّی امداد کے بعد تنویر احمد کی حالت قدرے سنبھل چکی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق اُن پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور جسم کا دایاں حصہ متاثر ہوا تھا اور اُنھیں بولنے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔

سلمٰی بیگم نے یہ وقت بڑی مشکل سے گزارا۔ اُنھوں نے نہ صرف حوصلہ مندی سے خود کو سنبھالا، بل کہ شوہر کی خدمت اور بچوں کی دیکھ بھال بھی کرتی رہیں۔ تنویر احمد پندرہ دن تک ہسپتال میں رہے، جس کے بعد ڈاکٹروں نے انھیں فارغ کر دیا اور اُن کا باقی علاج گھر میں شروع ہو گیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹروں نے اُنھیں ہفتہ وار چیک اپ کا بھی مشورہ دیا تھا۔

اُدھر تنویر احمد کا منیجر جمال گھر پر مسلسل چکر لگا رہا تھا کہ کاروبار خسارے میں ہے اور مزدوروں کو بھی بمشکل آدھی تنخواہ کی ادائیگی ہوئی ہے اور یہ کام بھی میں نے آپ سے اجازت لیے بغیر کیا ہے، کیوں کہ اُن دنوں آپ بہت زیادہ پریشان تھیں اور تنویر صاحب ہسپتال میں تھے۔

''جمال صاحب! آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں آپ کی اس معاملہ فہمی سے بہت خوش ہوں۔'' سلمٰی بیگم نے پردے کی اوٹ سے کہا۔

''لیکن بیگم صاحبہ! اب آگے کیا کیا جائے؟'' جمال نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں۔ خدائے بزرگ و برتر بہتری فرمائیں گے۔'' سلمٰی بیگم نے بظاہر بڑے اعتماد سے کہا، مگر اندر سے وہ بھی فکرمند تھیں۔ شوہر کی بیماری اور اُن کے کاروباری خسارے کی فکر اُنھیں پریشان کر رہی تھی، لیکن اُنھوں نے جمال کو اپنے بیمار شوہر سے ملنے نہ دیا اور خود گاہے بگاہے باپردہ فیکٹری کے چکر بھی لگانے لگیں۔

منیجر جمال ایک نیک طبیعت، ایماندار اور فرض شناس انسان تھا۔ اُس نے بڑے احسن طریقے سے سلمٰی بیگم کی راہ نمائی کی۔ سلمٰی بیگم بے چاری اپنے شوہر کی تیمارداری کے ساتھ ساتھ فیکٹری جاتی تھیں، تاکہ کاروبار کو بھی دیکھ سکیں اور ملازمین کو تسلّی بھی دے سکیں۔ وہ سارا دن ایک مشین کی طرح کام کرتیں، مگر ماتھے پر ایک بل بھی نہ آنے دیتیں۔

تنویر احمد اور سلمٰی بیگم کا بڑا بیٹا ارشد، جو میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھا، اس قابل تھا کہ اس مشکل وقت میں والدین کی مدد کر سکے، مگر اِس حوالے سے وہ خاصا بے پروا ٹھہرا تھا۔ والدین اُسے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے، مگر اُس کا تعلیم کی طرف بالکل رُجحان نہیں تھا۔ اُس نے بمشکل میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا اور والد نے اپنے تعلقات کی وجہ سے اُسے ایک اچھے کالج میں داخل کروایا تھا، مگر ارشد سارا سارا دن اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ گھومتا رہتا اور کالج سے بھی اکثر غائب رہتا۔ اُسے اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ اُس کے والد اِن دنوں بیمار ہیں اور کاروبار بھی خسارے میں چل رہا ہے۔ ایک دن جب سلمٰی بیگم گھر پر ہی تھیں، ارشد باہر سے آیا اور بولا:

''امی جان! مجھے دو لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ میرے سب دوستوں کے پاس گاڑی ہے اور اُن کے کمرے بہترین قسم کے فرنیچر اور آرائشی سامان سے سجے ہوئے ہیں اور میں ہوں کہ اب تک ایک پُرانی سی موٹر سائیکل اور پُرانے فیشن کے کمرے میں گزارا کر رہا ہوں۔ میں اپنے ایک دوست سے بہتر حالت کی پُرانی کار خریدنا چاہتا ہوں اور کمرے کو قیمتی فرنیچر سے سجانا چاہتا ہوں۔ کچھ رقم میرے پاس بھی جمع ہے، لہٰذا آپ فوری طور پر مجھے دو لاکھ روپے دے دیں۔''

ارشد کی باتیں سن کر سلمٰی بیگم بولیں:

''بیٹا! ہمارے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ فالتو اخراجات بڑھا سکیں۔ تھوڑا بہت جو بینک بیلنس تھا، وہ بھی ختم ہونے کو ہے۔ تمھارے ابا جان بیمار ہیں، اُن پر بھی پیسے خرچ ہو رہے ہیں اور کاروباری حالات بھی خراب ہیں۔ تم اب جوان ہو اور جانتے ہو کہ موجودہ حالات میں تمھیں کیا کرنا چاہیے، لہٰذا اپنی تمام فضول خرچیوں کو چھوڑ کر ہمیں حوصلہ دو اور باپ کا سہارا بننے کی کوشش کرو۔ خدا نے چاہا تو تمھیں گاڑی اور کمرے کے لیے نیا سامان بھی مل جائے گا۔''

ماں کی یہ نصیحت آمیز باتیں سن کر اُس وقت تو ارشد وہاں سے چلا گیا، لیکن دو دِن بعد اُس نے پھر رقم کا تقاضا کر دیا اور ماں سے صاف کہہ دیا کہ اگر اُس کی بات نہ مانی گئی تو وہ بھوک ہڑتال کر دے گا۔ بیٹے کی یہ دھمکی آمیز باتیں سن کر ماں کی محبت غالب آ گئی اور وہ بظاہر پیار سے، مگر اندر سے دکھ بھرے لہجے میں بولیں:

''بیٹا! شاید تمھیں مسائل کا احساس نہیں۔ میرے پاس تو اِس وقت سوائے زیورات کے کچھ نہیں ہے۔ اگر تم چاہو تو میں اُنھیں بیچ دیتی ہوں۔''

ارشد پر تو اُس وقت گاڑی اور قیمتی آرائشی سامان خریدنے کا جنون طاری تھا، لہٰذا اُس نے ماں کو زیورات بیچنے کا کہہ دیا اور اگلے دن ہی سلمٰی بیگم نے دُکھی دل کے ساتھ اپنے زیورات بیچ کر مطلوبہ رقم ارشد کے حوالے کر دی۔ اُنھوں نے گاڑی خریدنے کے لیے اپنے ڈرائیور کو اُس کے ساتھ بھیجا۔ ارشد نے اپنے اکاؤنٹ سے بھی جمع شدہ رقم نکالی اور اگلے دن ایک پرانی گاڑی اور کمرے کے لیے نیا امپورٹڈ فرنیچر، صوفے اور قالین وغیرہ لے آیا۔ اب وہ سارا دن دوستوں کے ساتھ گاڑی میں سیر کرتا یا اپنے سجے سجائے کمرے میں دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا۔ ساتھ ساتھ دعوتیں بھی ہوتی تھیں۔

ایک دن سلمٰی بیگم نے اُس کی حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی آوارگی کا نوٹس لیا اور اُسے اپنی تعلیم کی طرف توجہ دینے کو کہا، جس پر ارشد نے اُنھیں بتایا کہ وہ ایک ماہ قبل کالج چھوڑ چکا ہے۔ ارشد نے تو یہ بات بڑی ڈھٹائی سے کہہ دی تھی، مگر سلمٰی بیگم کی تو گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ اُنھیں یوں لگا جیسے ارشد کے حوالے سے دیکھے ہوئے اُن کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے ہیں۔ اُنھوں نے پہلی مرتبہ ارشد کو ڈانٹا اور سرزنش کی، لیکن جوان بیٹے پر وہ ہاتھ نہیں اُٹھا سکتی تھیں، لہٰذا خاصی ناراضی کے بعد اُسے پیار سے سمجھایا کہ وہ نہ صرف فوری طور پر کالج جانا شروع کر دے، بل کہ بیمار والد کی دیکھ بھال اور مدد کرے۔ اس کے علاوہ خسارے میں ڈُوبی ہوئی اُن کی فیکٹری میں جا کر وہاں کے معاملات

سنبھالنے اور سمجھنے کی کوشش کرے، لیکن ارشد نے سلمٰی بیگم کی یہ باتیں ایک کان سے سنیں اور دُوسرے سے نکال دیں، کیوں کہ اُسے تو آوارگی اور تن آسانی کی عادت پڑ چکی تھی اور وہ کسی نہ کسی طرح لڑ جھگڑ کر ماں سے روزانہ کا خرچہ بھی لے لیتا تھا اور پھر سارا دن سیر و تفریح میں گزارتا تھا۔ سلمٰی بیگم بہت پریشان تھیں، کیوں کہ ارشد اَب بدتمیز بھی ہوتا جا رہا تھا، حالاں کہ اُس کے برعکس سلمٰی بیگم کے دوسرے دونوں بچے نہایت با اخلاق تھے، لیکن وہ ابھی چھوٹے تھے اور سلمٰی بیگم کو خطرہ تھا کہ کہیں وہ بھی ارشد کی موجودہ روش کو اِختیار نہ کر لیں۔

سلمٰی بیگم اپنے شوہر کی بیماری، کاروباری خسارے اور اَرشد کی لاپرواہی، نافرمانی اور غلط روّیے کی وجہ سے شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھیں۔

ایک دن سلمٰی بیگم نے اسی پریشانی کے عالم میں ارشد کے اُردو کے اُستاد کو اپنے گھر بُلایا۔ سراج صاحب کا گھر اُن کے قریب ہی واقع تھا اور وہ نہایت نیک طبیعت انسان تھے۔ اُنھوں نے تنویر احمد کی عیادت کی اور پھر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ سلمٰی بیگم نے چائے پینے کے دوران میں اُنھیں پردے کی اوٹ سے ارشد کے منفی روّیے اور سارا دن دوستوں کے ساتھ آوارہ گھومنے کے بارے میں بتایا۔ یہ سُن کر سراج صاحب کو نہایت افسوس ہوا۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ ارشد کالج سے غائب ہے، مگر اُنھیں تنویر احمد کے گھریلو حالات اور کاروباری مسائل کی خبر نہ تھی۔ اب جو صورتِ حال سامنے آئی تو اُنھوں نے انسانی ہمدردی کے تحت تنویر اَحمد اور سلمٰی بیگم کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور بولے:

''آپ فکر نہ کریں، میں ارشد کو سمجھانے کی پوری کوشش کروں گا اور اگر خدائے بزرگ و برتر نے چاہا تو وہ سیدھے راستے پر آ جائے گا۔''

ابھی اُن کی یہ گفتگو جاری تھی کہ ارشد کمرے میں داخل ہوا اور اپنے اُستاد سراج صاحب کو وہاں دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور حیرت کی تصویر بنتے ہوئے بولا:

''سر! آپ یہاں..... کیسے آئے؟''

''بھئی، تم سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا، سو آ گیا۔ تم کالج کیوں نہیں آ رہے؟ آخر کیا بات ہے؟'' سراج صاحب نے انتہائی شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ..... وہ میں..... سر!'' ارشد گھبرا گیا اور کوئی مناسب جواب نہ دے سکا۔

''بھئی، میں تمھارا تھوڑا سا وقت چاہتا ہوں، تم اپنے کمرے میں چلو، تاکہ تم سے علاحدگی میں چند باتیں ہو سکیں۔'' سراج صاحب نے کہا اور اَرشد اُنھیں اپنے کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں پہنچ کر سراج صاحب حیران رہ گئے، کیوں کہ پورا کمرا انتہائی خوب صورت غیر ملکی فرنیچر اور قالین سے سجا ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر سراج صاحب ارشد سے یوں گویا ہوئے:

''تمھیں تو یہ معلوم ہے کہ میں اپنے دورانیے میں شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کے اشعار خاص طور پر پڑھتا ہوں اور اُن کی آسان تشریح بھی کرتا ہوں۔ اقبال ہمارے قومی شاعر ہیں، وہ نئی نسل سے بہت پُر اُمید تھے اور وہ جوانوں کو بلند پرواز شاہین جیسا دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اپنی شاعری میں وہ نئی نسل کو مشرقی روایات چھوڑنے والے نوجوان کے روپ میں دیکھتے ہیں تو اُن کی آنکھیں خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ بیٹا! اقبال کے اشعار و اَفکار کی روشنی میں مغربیت کے حصار سے نکلو، جو بظاہر تمھاری آنکھیں چندھیا رہا ہے، مگر دَرحقیقت نئی نسل کی تباہی کا باعث ہے، لہٰذا بحیثیت مسلمان ہمیں اپنی ساری زندگی قرآن و سنت کی روشنی میں گزارنی چاہیے۔ مجھے اُمید ہے تم بھی اپنے اندر اِقبالؒ کے شاہین جیسی صفات پیدا کرو گے۔''

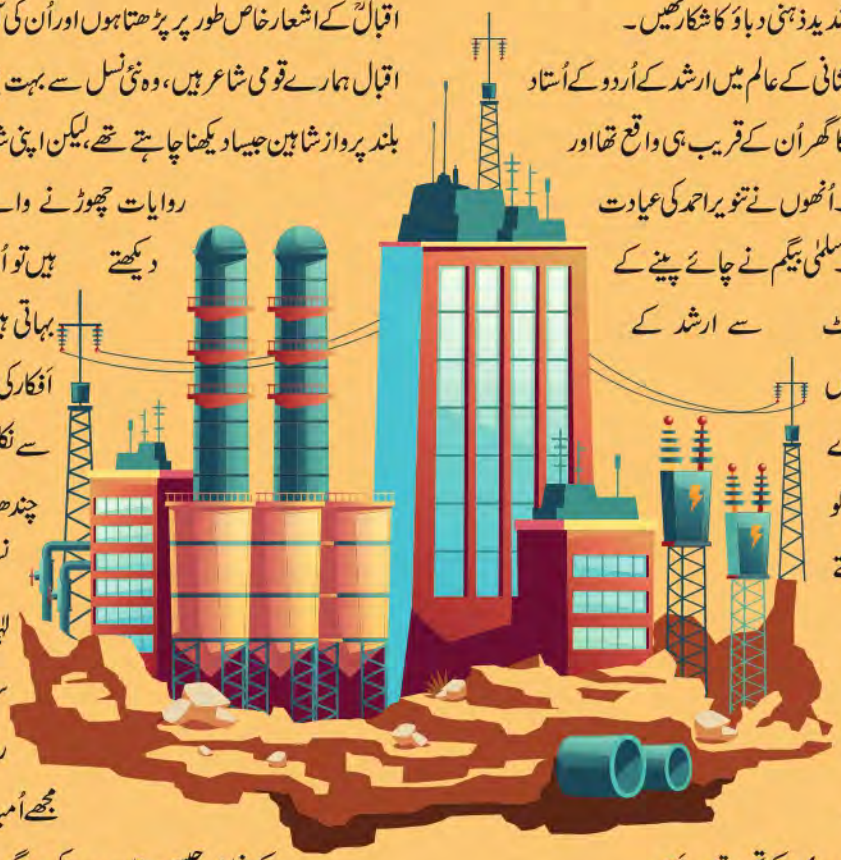

یہ نصیحت آمیز گفتگو کر کے سراج صاحب تو وہاں سے چلے گئے، لیکن ارشد کو یوں لگا کہ جیسے کسی نے اُسے اندر سے بُری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اُس پر وقتی طور پر تو اِن باتوں کا اثر ہوا، لیکن اُس کے شب و روز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اِسی طرح کئی دن گزر گئے، اور اُس نے کالج جانا بھی شروع نہ کیا۔

ایک صبح جب اُس نے اپنی والدہ سے گاڑی کے پیٹرول کے لیے پیسے مانگے تو اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور وہ نہایت افسردہ لہجے میں بولیں:

''بیٹا! ابھی ابھی مینجر جمال آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ پانچ لاکھ

روپے کی فوری ضرورت ہے۔ ایک تو ملازمین کی تنخواہیں دینی ہیں اور کچھ دوسری ادائیگیاں بھی کرنی ہیں اور ہماری فیکٹری کے دونوں اکاؤنٹ میں اتنی کم رقم رہ گئی ہے جو ہمارے گھریلو اخراجات کے لیے بھی ناکافی ہے۔ پچھلے ماہ ورکرز کو آدھے مہینے کی تنخواہ دی گئی تھی اور اَب اُنھیں پورے ڈیڑھ ماہ کی تنخواہ دینی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ لوگ مشتعل بھی ہو سکتے ہیں اور ہماری فیکٹری بند بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ہماری عزت کا معاملہ بھی ہے۔ اب بتاؤ میں کیا کروں، تم ہی کچھ سوچو۔ خدا کے واسطے اپنے اس روّیے میں تبدیلی پیدا کرو اور عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر اِس مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دو۔

مجھے تو حیرت ہے کہ تم پر نہ تو میری کسی نصیحت کا اثر ہوا اور نہ ہی تم نے اپنے اُستاد سراج صاحب کی باتوں پر عمل کیا۔ اگر مستقبل میں بھی تم نے ایسا ہی روّیہ رکھنا ہے تو خدا سے دُعا کرو کہ تمھارے والدین مر جائیں۔''

یہ کہتے ہوئے سلمٰی بیگم انتہائی جذباتی ہو رہی تھیں اور اَرشد پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں احساسِ ندامت سے شرابور تھا۔ اُس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ ہر طرح کی لاپرواہی اور نافرمانی کے باوجود وہ اپنے والدین کی موت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی والدہ کی باتیں سُن کر وہ کافی دیر تک سر جھکائے خاموش کھڑا رہا، پھر کچھ حوصلہ کر کے بولا:

''امی جان! خدا آپ کو اور اَبا جان کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ مجھے آج اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں اپنی بے کار قسم کی تفریح اور تن آسانیوں میں یہ بھول گیا تھا کہ ہماری روایات کیا ہیں اور ہمارا دین ہمیں والدین کی عزت اور اِحترام کرنے کا کس طرح درس دیتا ہے۔ خدا نے چاہا تو آئندہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

سلمٰی بیگم نے جب اپنے بیٹے کی یہ باتیں سنیں تو وہ بہت خوش ہوئیں اور پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

اُس وقت ارشد وہاں سے چلا گیا۔ شام کو جب وہ گھر واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جو اُس نے خاموشی سے اپنی ماں کے حوالے کر دیا۔ سلمٰی بیگم نے جب لفافہ کھولا تو اُس میں اچھی خاصی رقم تھی۔ اُنھوں نے حیرت سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور فکرمند ہو کر بولیں:

''بیٹا! یہ پیسے کہاں سے لائے ہو؟''

''امی جان! میں نے اپنی گاڑی اور کمرے کا قیمتی سامان بیچ دیا ہے۔''

ارشد نے گویا دھماکا کیا۔

سلمٰی بیگم اپنے بیٹے کے اندر ہونے والی اس بڑی تبدیلی پر حیران رہ گئیں۔ اُن کی دُعائیں رنگ لے آئی تھیں، مگر یہ رقم ناکافی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب ارشد دوبارہ اپنی والدہ کے سامنے آیا تو اُس کا چہرہ خاصا پُرسکون تھا، جیسے اُس نے اپنے دل سے کوئی بوجھ اُتارا ہو۔

سلمٰی بیگم، ارشد کے اندر ہونے والی ان مثبت تبدیلیوں سے مسلسل حیران تھیں۔

''امی جان! آپ ابا جان سے مشورہ کر لیں، اگر وہ اجازت دیں تو آپ مکان بیچ دیں، تاکہ ملازمین کی تنخواہ اور دوسری ادائیگیاں ہو سکیں اور کچھ رقم کاروبار کو سنبھالنے میں بھی لگ سکے۔ جہاں تک میرا سوال ہے تو میں اب ہر جگہ رہنے کے لیے تیار ہوں۔ میرا خیال ہے کہ نائلہ اور رِیحان بھی کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔''

ارشد نے یہ بات کہی تو سلمٰی بیگم نے پیار اور خوشی سے اُس کا ماتھا چوم لیا۔ آخر کار اَرشد کے اندر کے اندھیروں میں روشنی کی کرن نمودار ہو گئی تھی اور وہ سیدھے راستے پر چل پڑا تھا۔

سلمٰی بیگم نے اپنے شوہر تنویر احمد سے اس سلسلے میں بات کی تو موجودہ بحران کو دیکھتے ہوئے وہ مکان بیچنے پر رضامند ہو گئے۔ پندرہ مرلے کا یہ کوٹھی نما ڈبل اسٹوری مکان چند دنوں میں ہی تین کروڑ روپے میں بک گیا اور سلمٰی بیگم نے اپنے لیے پانچ مرلے کا ایک خوب صورت سا مکان ۷۰ لاکھ روپے میں خرید لیا اور وہ وہاں شفٹ ہو گئے۔

ارشد نے مینیجر جمال کے مشورے سے ملازمین کی تنخواہیں اور دوسری ادائیگیاں بھی کر دی تھیں، جب کہ باقی رقم بینک میں جمع کروا دی گئی تھی۔ اس نے کالج جانا بھی شروع کر دیا تھا اور روزانہ کچھ دیر کے لیے وہ اپنے والد کے دفتر بھی جاتا تھا۔ ارشد اپنی تعلیم پر بھی بھرپور توجہ دے رہا تھا۔ اس سارے معاملے میں اُس کی والدہ سلمٰی بیگم اور اُستاد سراج صاحب اُس کی خصوصی راہ نمائی فرما رہے تھے۔

تقریباً تین چار ماہ کی توجہ اور محنت سے اُن کا کاروبار کافی سنبھل گیا تھا اور تنویر احمد کی صحت بھی بہتر ہونا شروع ہو گئی تھی، لیکن وہ ابھی دفتر جانے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ سلمٰی بیگم اپنے بیٹے کے پوری سنجیدگی سے ذمے داریاں سنبھالنے پر بہت خوش تھیں۔ سراج صاحب بھی مطمئن تھے کہ ارشد اب ایک تن آسان اور مغرب زدہ نوجوان کی بجائے مشرقی اقدار کا علم بردار اور اِقبال کا شاہین بن چکا تھا۔

تین کا اچار

ادارہ

جی ہاں دوستو! اس بار بھی ہم جو کھیل لے کر حاضر ہوئے ہیں، اس میں ''چار'' ہی کا پرچار ہے، جو آپ کو مزید سوچ و بچار کا موقع فراہم کرے گا۔

اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس کھیل میں ہم کسی طرح ''تین'' کو ''چار'' بنانے کی کوشش کریں گے تو یہ درست نہیں۔

بہتر یہ ہے کہ اپنے خیالی گھوڑے دوڑانے کے بجائے اگلی سطور پر توجہ دیں، ہم کون سا بغیر بتائے بھاگے جا رہے ہیں۔

تو دوستو! کھیل یہ ہے کہ ذیل کی ہر سطر میں ہم نے تین خالی جگہیں چھوڑی ہیں، پہلی خالی جگہ میں جو لفظ آئے گا، وہ ''چ'' سے شروع ہوگا، دوسری خالی جگہ میں جو لفظ آئے گا، اس کا آغاز ''ا'' سے ہونا چاہیے اور تیسری خالی جگہ میں جو لفظ آئے گا، اس کی ابتدا ''ر'' سے ہوگی، یوں ان تین خالی جگہوں میں آنے والے الفاظ کے ابتدائی حروف کو دیکھا جائے تو ''چار'' بن جائے گا، جسے ہم ''تین کا چار'' کہہ سکتے ہیں۔

آپ کا جواب ۳۰ نومبر تک کوپن کے ساتھ ہمیں موصول ہو جانا چاہیے۔

آپ کی آسانی کے لیے ایک مثال بھی پیش کر دیتے ہیں:

☆ ''ذوق'' کا لفظی ترجمہ ہے: ''چاہت''، اور ''و'' کا مطلب ہے: ''اور''، جب کہ ''شوق'' کے لفظی معنی: ''رغبت'' ہیں۔

۱ ''.....'' کام ''.....'' کو ''.....'' کرنے چاہییں: خود سیکھنا، اوروں کو سکھانا، خالق کی عبادت کرنا، مخلوق کی خدمت کرنا۔

۲ ''.....'' ''.....'' ''.....'' یہ تینوں ہم قافیہ بھی ہیں اور تقریباً ہم معنی بھی۔

۳ ''.....'' ''.....'' ''.....'' اور ''.....'' یہ تینوں ملک دنیا کے بڑے ممالک میں شمار ہوتے ہیں۔

۴ ''.....'' فارسی کا لفظ ہے، ''.....'' ہندی کا، جب کہ ''.....'' انگریزی کا، مزے کی بات یہ ہے کہ تینوں میں لفظ ''چار'' ہے۔

۵ ''.....'' ایک پرندہ ہے، ''.....'' ایک چرندہ ہے اور ''.....'' ایک درندہ ہے۔

۶ ''.....'' میں سے ''.....'' نکالیں تو چار ''.....'' جاتے ہیں۔

مصعب اور مدرسہ

انعم توصیف۔ کراچی

''السلام علیکم! کیسا گزرا میرے بیٹے کا مدرسے میں آج کا دن؟''

کرونا کی وبا کے بعد مصعب تقریباً چھے ماہ بعد روتے ہوئے مدرسے گیا تھا۔ اپنے مقررہ وقت پر وہ منہ پھلا کر گھر میں داخل ہوا تو مسفرہ بیگم نے آگے بڑھ کر خود ہی اسے سلام کرلیا۔

''وعلیکم السلام!'' مصعب نے دھیمی آواز میں سلام میں پہل نہ کرنے پر دِل ہی دل میں شرمندہ ہوتے ہوئے اپنی والدہ کو جواب دیا۔

''جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدل لو۔ میں نے آج اپنے بیٹے کے لیے بریانی بنائی ہے۔'' پیار سے اس کے گال چومتے ہوئے انھوں نے نرمی سے کہا۔

مصعب ایک فرماں بردار بچہ ہے۔ وہ چوتھی جماعت کا طالب علم ہے۔ تجوید سے بخوبی ناظرہ قرآن پڑھنے کے بعد مصعب کے مدرسے کے استادِ محترم نے اس کی ذہانت دیکھتے ہوئے قرآن پاک حفظ کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ حفاظ کو جب بنا دیکھے قرآن پڑھتا دیکھتا تو بہت حیران ہوتا۔ اس کا بھی دل چاہتا کہ وہ اس طرح قرآن پاک پڑھے۔ استاد صاحب کے کہنے پر اُس کے شوق میں اضافہ ہوا اور اُس نے اپنے والدین سے اس خواہش کا اِظہار کیا۔

پہلے تو اُس کے والدین خاصے تذبذب کا شکار رہے، لیکن مصعب کی ضد اور اُس کے استاد صاحب کی تسلی کے بعد اُنھوں نے اسکول کی تعلیم روک کر مصعب کو مدرسے میں داخل کروا دیا۔

استاد صاحب نے یقین دہانی کروائی تھی کہ دو سال میں با آسانی مصعب حفظ مکمل کرلے گا، پھر اُسے اسکول میں داخل کروا دیا جائے۔ مصعب نے تین ماہ میں پانچ پارے حفظ کرلیے۔ وہ خوشی خوشی مدرسے جاتا، دل لگا کر سبق یاد کرتا۔ مصعب کو یوں قرآن پاک پڑھتا دیکھ کر اُس کے والدین بھی خوشی سے پھولے نہ سماتے اور اُن کے دل سے استاد صاحب کے لیے دعائیں نکلتیں۔

وبا کی وجہ سے اتنے مہینوں کی تعطیلات کے بعد اَب مصعب کو مدرسے جانا کسی بوجھ سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ چھٹیوں کے دوران میں وہ کبھی قرآن پاک کی تلاوت کرلیتا اور کبھی نہ کرتا۔ اسی وجہ سے اس کے یاد کیے گئے پارے بھی اب اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھے۔

''مصعب بیٹا! چلو سبق یاد کرنے بیٹھو۔'' مغرب کی نماز کے بعد مسفرہ بیگم نے اسے گم صُم بیٹھے دیکھا تو اُس کے قریب آ کر پیار سے کہا۔

''امی! میں آپ سے ایک بات کہوں۔'' مصعب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''میں حفظ نہیں کرنا چاہتا۔'' اس کے یہ الفاظ مسفرہ بیگم کے دل پر بم کی طرح گرے۔ صبح جب وہ مدرسے نہ جانے کی ضد کر رہا تھا، تب انھوں نے سوچا تھا کہ اتنے دنوں کے بعد روزمرہ کی زندگی کی جانب پلٹنا بڑوں

کے لیے مشکل ہے تو پھر بچے تو بچے ہیں، لیکن اس وقت مصعب کے منہ سے نکلنے والے الفاظ اُن کے لیے ناقابلِ یقین تھے۔

''چلو ٹھیک ہے، میرے بیٹے! جیسے تمھاری مرضی۔ تم نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ تم کمرے میں جا کر آرام کرو۔'' اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتیں، کمرے میں داخل ہوتے عمیر صاحب نے مصعب کی بات سن کر مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔

مصعب نے حیرت سے اپنے والد کو دیکھا اور تیزی سے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' مسفرہ بیگم نے ناراضی سے ان کی جانب دیکھا۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک صفحہ اپنی بیگم کے سامنے کر دیا۔ جس پر لکھے الفاظ پڑھ کر وہ گنگ رہ گئیں۔

مدرسہ چھوڑنے کی اطلاع جیسے ہی مصعب کے استاد ''فاروق ربانی'' صاحب کو ملی، تبھی سے وہ بے چین تھے کہ وقت نکال کر کسی نہ کسی طرح مصعب کے گھر جا کر اُس سے ملاقات کریں۔ بالآخر ہفتہ بھر بعد وہ مصعب کے گھر کی بیٹھک میں اس کے والد صاحب کے سامنے براجمان تھے۔

''میری سمجھ سے باہر ہے کہ مصعب جیسا ہونہار بچہ بھلا کیسے اس طرح بیچ میں..... مجھے یہ بتائیے، کیا آپ نے اسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟'' رسمی گفتگو کے بعد اُنھوں نے جب یہ کہا تو عمیر صاحب نے مصعب کے کمرے سے ملنے والے صفحے پر لکھے الفاظ انھیں سُنا دیے، جسے سن کر اُنھوں نے عمیر صاحب کو کچھ کہہ کر شرمندہ کرنے کے بجائے ان سے مصعب کو بلانے کی درخواست کی۔

مصعب نے ڈرتے ڈرتے استاد صاحب کو سلام کیا۔ اس کا خیال تھا کہ امی ابو نے بھلے ہی کچھ نہ کہا ہو، مگر اُستاد صاحب اسے ضرور ڈانٹیں گے، مگر اُن کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر اُس کا خوف رفو چکر ہو گیا۔

''کیسے ہو مصعب!؟ تم تو بھئی بغیر بتائے مدرسہ چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے سوچا کہ میں خود ہی تم سے مل آؤں۔''

''جی، وہ بس.....''

''چلو کوئی بات نہیں، تمھاری مرضی ہے بیٹا!''

''جی۔''

''اب کیا کرتے ہو سارا دن؟''

''سارا دن کھیلتا ہوں، ٹی وی دیکھتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں استاد صاحب!'' اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمم..... چلو مرضی تمھاری، بس وہ فرشتے تمھارا اِنتظار کرتے ہوں گے روزانہ، تبھی میں نے سوچا کہ تم سے ملاقات کر آؤں۔''

''فرشتے! لیکن فرشتے میرا کیوں انتظار کرتے ہوں گے استاد صاحب!؟'' اس نے حیرت اور دل چسپی کی ملی جلی کیفیت سے پوچھا۔

''تمھیں نہیں پتا کیوں انتظار کرتے ہوں گے؟'' استاد صاحب نے بھی مصنوعی حیرانی سے سوال کیا۔ مصعب نے نفی میں سر ہلایا تو وہ گویا ہوئے:

''وہ اس لیے کہ جب کوئی طالب علم، علم حاصل کرنے جاتا ہے تو فرشتے اس کے راستے میں اپنے پَر بچھا دیتے ہیں اور جب کوئی قرآن پاک پڑھتا ہے تو فرشتے اسے سننے کے لیے اس تلاوت کرنے والے کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔''

''فرشتے جمع کیوں ہو جاتے ہیں؟ وہ خود قرآن پاک کیوں نہیں پڑھ لیتے؟''

''اس لیے کہ فرشتوں کو اللہ پاک نے قرآن پاک پڑھنا نہیں سکھایا ہے، تبھی وہ سننے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔''

''استاد صاحب! وہ تو میں گھر میں بھی پڑھوں گا، تب بھی جمع ہو جائیں گے، بل کہ میں ایسا کروں گا کہ ناظرہ قرآن کی دُہرائی کے لیے مدرسے آ جایا کروں گا۔'' مصعب نے معصومیت سے کہا تو وہ بھی مسکرا دیے۔

''بالکل! لیکن مجھے ایک اور بات کی بھی تو فکر ہے۔''

''ایک اور بات؟''

''وہ بات یہ کہ جنت میں جو درجات اور بادشاہت حافظ مصعب کو ملنے والی ہے اس کا کیا ہو گا؟''

''میرے لیے درجات اور بادشاہت!؟'' مصعب نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

''جی، میں آپ کو ایک حدیث سناتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

'(قیامت کے دن) حافظ قرآن سے کہا جائے گا: پڑھتا جا اور (جنت کے درجوں پر) چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جس طرح تُو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا، پس تیرا ٹھکانا اس آخری آیت کے پاس ہو گا جو تُو پڑھے گا۔' اب جو قرآن پاک حفظ کرے گا اور اُس پر عمل بھی کرے گا تو یہ درجات اسی کو ملیں گے نا! اب جب اونچے درجات ملیں گے تو یقیناً حافظ قرآن ان میں بادشاہوں جیسی زندگی گزارے گا۔'' انھوں نے نرم لہجے میں اسے بتاتے ہوئے

پُرامید نظروں سے مصعب کی جانب دیکھا۔

''لیکن میں مدرسے میں بہت تھک جاتا ہوں، مجھے کھیلنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔''

''بیٹا! اتنے درجات حاصل کرنے کے لیے تھوڑی تو محنت کرنی پڑے گی، لیکن اب سے میرا اِرادہ ہے کہ مدرسے میں آدھا گھنٹا ہم بچوں کو اچھی اچھی کہانیاں سنائیں گے اور آدھا گھنٹا کھیل کود کا الگ سے آپ سب کو دیا جائے گا، ان شاءاللہ!'' استاد صاحب نے وہاں بیٹھے بیٹھے ہی پُرعزم لہجے میں کہا۔

''مجھے معاف کر دیں استاد صاحب!''

انھوں نے پیار سے مصعب کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُسے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

.....☆.....

''مما! جلدی سے کھانا دے دیجیے۔ مجھے سونا ہے، ورنہ فجر کی نماز اور مدرسے جانے میں دیر ہو جائے گی۔'' استاد صاحب کے جانے کے بعد عشا کی نماز پڑھ کر مصعب نے کہا تو اُس کے والدین نے خوش گوار حیرت سے اسے دیکھا۔ ان کے دل پر ڈھیروں سکون اتر آیا۔

''مجھے کل مدرسے جانا ہے۔ مجھے جنت میں اپنے درجات بلند کرنے ہیں۔ سوری اللہ میاں! میں بُرا بچہ بن گیا تھا۔ اب میں فرشتوں کو ضرور قرآن پاک سناؤں گا۔'' مصعب نے اپنی عادت کے مطابق اپنا روزمرہ کا معمول ڈائری میں لکھتے ہوئے یہ آخری جملہ لکھا اور سکون سے سو گیا۔

''اللہ کا شکر ہے!'' اس کے سونے کے بعد عمیر صاحب اور مسفرہ بیگم نے اپنے کمرے کا رُخ کیا اور رَب کا شکر ادا کیا اور اپنے کمرے میں آ کر وہ صفحہ پھاڑ کر پھینک دیا، جس پر عمیر نے دل برداشتہ ہو کر لکھا تھا کہ ''مجھے نہیں اچھا لگتا اب مدرسہ۔ آج مما نے مجھے پہلی بار مدرسے نہ جانے کی وجہ سے بہت ڈانٹا۔ مجھے اب گھر میں رہنا اور ٹی وی دیکھنا اچھا لگتا ہے۔''

انھوں نے اطمینان سے سامنے دیکھا۔ ٹی وی کی جگہ اب خالی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ السنن لأبی داود، کتاب العلم، باب الحث علی طلب العلم۔ الرقم: ۳۶۴۱۔

۲۔ الصحیح لمسلم، کتاب الذکر و الدعاء و التوبة، باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن۔ الرقم: ۷۰۲۸۔

۳۔ الصحیح للترمذی، فضائل القرآن، باب۔ الرقم: ۲۹۱۴۔

بقیہ: گلی نمبر سات

''میں واٹر بورڈ کے آپ جیسے لوگوں کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ مجھے آپ پر فخر ہے، میں آپ کا بھرپور ساتھ دوں گا۔ گھبرائیے نہیں، مجھے استاد حمو جیسے لوگوں کا مقابلہ کرنا اچھی طرح آتا ہے۔'' عبداللہ نے تو گویا شرافت کی ساری پریشانی ختم کر دی تھی۔ قانون حرکت میں آیا اور اُستاد حمو اپنے ساتھیوں سمیت پکڑا گیا۔ اس خبر کو خوب بڑھا چڑھا کر نشر کیا گیا۔

میں اپنی دکان پر بیٹھا یہ خبر سن رہا تھا کہ بلال کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ وال مین شرافت کو جانتا ہے، شرافت جیسے شریف اور دیانت دار ملازم کسی بھی محکمے کا اثاثہ ہوتے ہیں، ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے۔

شام کو میں بلال کے ساتھ ہاتھوں میں گُل دستہ لیے شرافت کے سامنے کھڑا تھا۔

''آپ ہمارے ہیرو ہیں، یہ پھول آپ کے لیے ہیں۔'' میں نے گل دستہ شرافت کی طرف بڑھایا۔

''بہت شکریہ۔'' شرافت نے گُل دستہ لیتے ہوئے کہا۔

پھر میں نے بلال اور اُس کی تنظیم کا تفصیلی تعارف کروایا تو شرافت گُل دستہ بلال کو دیتے ہوئے بولا:

''اس کے حق دار آپ ہیں۔ تھر میں پانی کی فراہمی نہایت اہم اور مفید کام ہے۔''

''آپ دونوں ہی اچھا کام کر رہے ہیں، یہ اچھا کام جاری رہنا چاہیے۔'' میں نے دونوں کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

ہماری موجودگی میں ایک بزرگ وہاں آئے اور شرافت کو دعائیں دیتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ شرافت کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

اس کے خیال میں اس کی نیکی اتنی بڑی نہیں تھی، جتنی اس کی پذیرائی کی جا رہی تھی۔

میں اس وقت وہاں کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ دنیا شرافت اور بلال جیسے نیک لوگوں کے باعث کسی بڑے عذاب سے بچی ہوئی ہے۔ یہ لوگ زمین کے ہیرے ہیں، ایسے ہیروں کی جس قدر بھی پذیرائی کی جائے، کم ہے۔

شرافت نے گلی نمبر سات میں وہ کام کر دکھایا تھا جو بلال اور اُس کی تنظیم تھر میں کر رہی تھی۔

ابا کی سائیکل

محمد رمضان شاکر۔ پاک پتن

سائیکل ہے یا مال کباڑی
چلا سکے نہ کوئی اناڑی
ہر دم یہ کھٹکا ہی رہے گا
شاید ٹوٹی کوئی گراری

وہ ہی اس پہ کرے سواری
خود کو جو سمجھے گا کھلاڑی
کھل کے اس کا انجر پنجر
آ نہ جائے نیچے گاڑی

ابا اس پہ گھوم چکے ہیں
سی ویو ، کلفٹن اور کیماڑی
تنگ وہ اس سے آتے نہیں ہیں
چاہے ہو کتنی بھی خواری

شاکرؔ ابا کو یہ بھائے
جیسے ہو یہ شاہی سواری
سائیکل ہے یا مال کباڑی
چلا سکے نہ کوئی اناڑی

قرآن کوئز ۳

سعد علی چھیپا۔ کراچی

عزیز قارئین! پیشِ خدمت ہے ایک نیا انعامی سلسلہ بنام ''قرآن کوئز''، جس میں آپ سے اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ''قرآن کریم'' کے بارے میں پانچ سوال پوچھے جائیں گے۔ صحیح جواب دینے پر آپ کو ملے گا بہترین انعام.....

تو دیجیے جواب اور لیجیے انعام.....

آپ کا جواب کوپن کے ساتھ ۳۰، نومبر ۲۰۲۰ء تک ہمیں مل جانا چاہیے۔

سوال

۱ وہ کون سی سورت ہے، جس کی ہر آیت میں لفظ اللہ موجود ہے؟

۲ قرآن پاک کی سب سے لمبی آیت کون سی ہے؟

۳ پہلی مدنی سورت کا نام بتائیں؟

۴ قرآن مجید کی ایسی کون سی دو سورتیں ہیں جو ایک ساتھ نازل ہوئیں؟

۵ سورتوں کی تعداد کے اعتبار سے قرآن مجید کا نصف کہاں ہوتا ہے؟

مجرم کی تلاش ①

محمد عمر بن عبدالرشید۔ کراچی

انسپکٹر فراز نے جلدی سے ناشتا کیا اور پولیس اسٹیشن جانے کے لیے گھر سے نکلے ہی تھے کہ ان کے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ انھوں نے جیب سے فون نکالا تو اُن کے اسسٹنٹ سب انسپکٹر اشعر کا فون تھا۔

''اشعر کا فون اتنی صبح! لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہے۔'' وہ بڑبڑائے اور پھر اُنھوں نے فون اٹھایا کیا تو دوسری طرف سے انسپکٹر اشعر کی پریشانی میں ڈوبی آواز سنائی دی:

''سر! ایک بہت بڑا مسئلہ ہوگیا ہے۔''

''کیا؟ جلدی بتاؤ۔'' انسپکٹر فراز بھی

پریشان ہوکر بولے۔

''فف..... فائل..... فائل غائب ہے۔'' انسپکٹر اشعر نے ہکلاتے ہوئے بات مکمل کی۔

''کیا!'' انسپکٹر فراز چلائے۔

''جی سر! فائل P-225 غائب ہے۔ اگر آئی جی صاحب کو یہ بات معلوم ہوگئی تو وہ کافی برہم ہوں گے۔'' انسپکٹر اشعر پریشانی کے عالم میں بولا۔

''آئی جی صاحب کے برہم ہونے کو تو چھوڑو۔ اس فائل میں ملک کی کافی اہم معلومات ہیں۔ اگر دشمن کو اِس بارے میں پتا چل گیا تو ملک کو کافی سنگین خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔'' انسپکٹر فراز کا انداز ڈانٹنے والا تھا۔

''اوہ!'' انسپکٹر اشعر کے منہ سے نکلا۔

''کیا تم نے سی۔ سی۔ ٹی۔ وی۔ فوٹیج چیک کی۔'' انسپکٹر فراز نے پوچھا۔

''فوٹیج کیسے چیک کرتا سر! کیمروں کا نظام ہی ناکارہ کیا جا چکا ہے، جب کہ مجرم انگلیوں اور جوتے کے نشانات بھی نہیں چھوڑ گئے۔'' انسپکٹر اشعر نے جواب دیا۔

''اوہ! میں ابھی وہاں آرہا ہوں۔ ویسے حیرت کی بات ہے کہ مجرموں کو ہمارے اس قدر خفیہ ٹھکانے کے بارے میں کیسے معلوم ہوگیا!؟'' انسپکٹر فراز نے حیران ہوکر کہا۔

''اس بات پر مجھے بھی حیرت ہے سر!'' انسپکٹر اشعر نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر فراز نے فون رکھا اور جیپ کی طرف بڑھے۔ جیپ میں بیٹھ کر اُنھوں نے جیپ اسٹارٹ کی اور تیزی سے خفیہ ٹھکانے کی طرف روانہ ہوگئے۔ خفیہ ٹھکانے پر پہنچے تو اَشعر اُنھیں کے انتظار میں کھڑا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی انسپکٹر اَشعر بولا:

''آیئے سر! آپ خود ہی چیک کر لیجیے۔''

انسپکٹر فراز آگے بڑھے اور خفیہ خانہ چیک کیا۔ اس کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ فائل خفیہ خانے میں موجود نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر اُنھوں نے نہایت باریک بینی سے پورا ٹھکانا چیک کر ڈالا، لیکن مجرم کوئی بھی ثبوت چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ وہ واپس انسپکٹر اشعر کے پاس آئے اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولے:

''کیا تم یہاں اکیلے آئے ہو؟''

''نہیں سر! میں جب یہاں آیا اور یہاں یہ صورتِ حال دیکھی تو کانسٹیبلز کو آنے کا کہا۔ جب وہ آگئے تو ہم نے ثبوت اکٹھے کرنے کی کوشش کی، لیکن کچھ بھی نہ ملا تو میں نے آپ کو فون کیا۔ آپ نے بتایا کہ آپ یہاں آرہے ہیں تو میں نے ان کی ضرورت محسوس نہ کی اور اُنھیں واپس بھیج دیا۔'' اشعر کہتا چلا گیا۔

''ہوں، لیکن تمھیں کس طرح پتا چلا کہ فائل غائب ہے۔'' انسپکٹر فراز نے پوچھا۔

.....(جاری ہے).....

اب سمجھ آ گئی

مریم وزیر۔ کراچی

ہرا دھنیا اپنی پتلی پتلی ٹانگوں سے تیز تیز چلا جا رہا تھا۔ اس کے سانس لینے کی آواز پودینے کو بھی سنائی دے رہی تھی۔ پودینے نے دو، تین دفعہ ہرے دھنیے کو آواز دی، مگر شاید اُس نے سنا ہی نہیں تھا۔ آخر تھک کر پودینے نے چیخ کر اُسے پکارا، مگر ہرا دھنیا شاید ناراض تھا یا غصے میں تھا، اس لیے نہ رکا، اب پودینہ آخر کر بھی کیا سکتا تھا، بس بیٹھ کر زور زور سے رونے لگا۔

ہرے دھنیے نے جب زور زور سے رونے کی آواز سنی تو رُک کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور اپنی پریشانی بھول کر پلٹ کر پودینے کے پاس آیا اور بولا:

''کیا ہوا؟''

پودینہ رونا چھوڑ کر ہرے دھنیے سے لپٹ گیا اور فوراً ہی پوچھنے لگا:

''کیا ہونا چاہیے مجھے؟ تم بتاؤ؟ میرا کیا قصور ہے؟ مجھ سے کیوں ناراض ہو؟''

ہرے دھنیے نے اپنے معصوم دل والے دوست کو تھپکا اور جواب دیا:

''کچھ نہیں اچھے دوست! تم سے ناراض نہیں ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ تمھارا کوئی قصور نہیں ہے۔ بس آج بات ہی کچھ ایسی ہوئی تھی کہ سمجھ نہیں آیا کہ کیا کروں، اس لیے تھوڑی دیر کے لیے باہر نکل آیا، تم پریشان نہ ہو۔''

پودینہ سیدھا ہوا اور پوچھا:

''کیا ہوا پیارے دوست!؟''

ہرے دھنیے نے کہا:

''چھوڑو، جانے بھی دو، اب تو عادت ہو جانی چاہیے تھی مجھے!''

پودینے نے کہا:

''پھر بھی بتاؤ، ہو سکتا ہے میں تمھاری مشکل حل کر دوں؟''

ہرے دھنیے نے بتانا شروع کیا:

''روزانہ کی طرح آج بھی امی جان نے ظہیر میاں سے پوچھا کہ آج کیا پکاؤں؟ تو ظہیر میاں جھٹ سے بولے، آلو گوشت!

امی جان نے خوب محنت سے کھانا بنایا۔

ظہیر میاں اسکول سے آئے تو کھانا تیار تھا۔ بہت ہی زبردست خوش بُو بھی آ رہی تھی۔

جب سب کھانا کھانے بیٹھے تو ایک دم ظہیر میاں کی نظر مجھ پر پڑی۔ انھوں نے امی سے کہا کہ آپ نے اسے کیوں شامل کیا؟ امی نے کہا کہ بیٹا! یہ تو بہت اچھا ہوتا ہے، مگر ظہیر بھائی نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔''

پودینے نے افسوس میں سر ہلایا اور بولا:

''واقعی، یہ تو بالکل بھی صحیح بات نہیں ہے۔''

ہرے دھنیے نے کہا:

''پودینہ! تمھیں معلوم ہے کہ میرے کس قدر فائدے ہیں، جو کہ نہ صرف ابھی حاصل ہوں گے، بل کہ ظہیر میاں جب بڑے ہو جائیں گے تب بھی کام آئیں گے۔ جیسے شوگر، بلڈ پریشر وغیرہ۔

میں پیٹ کے خراب جراثیم کو ختم کرنے میں بھی کام آتا ہوں، اچھی نیند لانے میں مدد دیتا ہوں، مگر ظہیر میاں سمجھتے ہی نہیں۔''

پودینے نے ہرے دھنیے کی بات سنی تو ایک دم اسے اپنے ساتھ ہونے والا واقعہ یاد آ گیا۔ وہ بولا:

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میرے ساتھ بھی ظہیر میاں ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس دن دعوت میں بریانی میں، میں بھی تھا تو یہ بھی نہ سوچا کہ بھائی کہیں اور آیا ہوں، بس چُن کر مجھے باہر نکال دیا۔

میں الرجی، دانت کے درد، پیٹ کے درد میں بہت کام آتا ہوں۔ نہ صرف یہ، بل کہ ٹوتھ پیسٹ اور دیگر کھانے پینے کی اشیا میں بھی پایا جاتا ہوں۔ میرے اتنے فائدے ہیں کہ خود ہی سوچنے میں بھی وقت لگتا ہے، مگر ظہیر میاں سمجھتے ہی نہیں۔''

.....☆.....

''ظہیر ظہیر!'' اچانک امی کی آواز سنائی دی۔

''بیٹا! آپ نے کھانا تو کھایا ہی نہیں اور کمرے میں آ کر سو گئے۔ آئیں آ کر کھانا کھا لیجیے۔''

ظہیر میاں نے اُٹھ کر دیکھا کہ وہ تو اپنے کمرے میں ہیں اور نہ ہرا دھنیا ہے نہ پودینہ، مگر اَب ظہیر میاں سمجھ گئے ہیں کہ انھیں کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں!

کیا آپ سمجھ گئے؟

بقیہ: کاش آپ جلدی آجاتے

برداشت نہیں کرسکتی، ان کا سامنا کرنا میرے بس میں نہیں ہے، مگر جلد ہی میں ان شاءاللہ! اسلام ظاہر کردوں گی۔'

اس کے بعد جتنے دن بھی ہم وہاں رہے وہ خاتون باقاعدگی سے ہمارا کھانا اور ناشتا لاتی رہی اور فرائض اور احکامِ اسلام سیکھتی رہی۔ اس کا وہ بیٹا بھی ساتھ ہوتا تھا جو گم ہوگیا تھا۔ اس خاتون نے اپنے اس بیٹے سے ہمارا تعارف بھی کروایا، وہ بھی بہت خوش ہوا، اس نے بھی کلمہ پڑھ لیا تھا۔

جس دن ہماری تشکیل مکمل ہوئی اور ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو وہ خاتون اس طرح بلک بلک کر روئی جیسے اس سے اس کا کوئی اپنا بہت ہی قریبی بچھڑ رہا ہو۔ بہرحال، ہم اس خاتون کو دِلاسا دیتے ہوئے اور اُس کے لیے استقامت کی دعا کرتے ہوئے اس سے اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہوگئے۔ واپسی پر ہم سب ساتھیوں نے یہ تہیا کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اس خاتون کی استقامت کے لیے دعا کرتا رہے گا اور الحمدللہ! ہم آج تک اس کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے دینِ حق پر استقامت نصیب فرمائے، اس کی تمام پریشانیوں کو دور فرمائے اور ہم سب کو دنیا اور آخرت، دونوں کی بھلائیاں اور کامیابیاں نصیب فرمائے۔ آمین، ثم آمین!

ہے یہ ایسا اک شہ پارہ

حافظ محمد اشرف۔ حاصل پور

ہاتھوں میں ہے خاص شمارہ
جو لے بھاگا قلب ہمارا
دل چسپی میں بڑھتا جائے
ہے انداز بھی اس کا پیارا
علم کا سب میں ذوق بڑھائے
لگتا ہے آنکھوں کا تارا
عمل کا دل میں شوق جگائے
ہے یہ ایسا اک شہ پارہ
چھوٹے بڑے سب پڑھیں اسی کو
سب کا ہے یہ راج دُلارا
کھیل ، کہانی ، نظمیں ، نعتیں
سب میں ہے یہ خوب نیارا
جب بھی پڑھوں اس کو اے حافظؔ!
پڑھنے کو دل کرے دوبارہ

کتاب دوست بنیے اور بنائیے

اپنے عزیز و اقارب اور رشتے داروں کے بچوں کو کتاب دوست بنانے اور صدقہ جاریہ میں حصہ لینے کے لیے ماہ نامہ "ذوق و شوق" کے سالانہ خریدار خود بھی بنیے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیجیے۔

سالانہ خریداری کے 1000 روپے آپ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر میں جمع کرواسکتے ہیں۔ اپنا نام، رابطہ نمبر اور جس ماہ سے جاری کروانا ہے ہمیں واٹس اپ کیجیے اور ہر ماہ گھر بیٹھے ماہ نامہ "ذوق و شوق" کا مطالعہ کیجیے۔

ZoqShoq

نام ____
مکمل پتا ____
ای میل ایڈریس ____
رابطہ نمبر ____
پوسٹ کوڈ ____
رقم ____
جاری کرنے کا مہینا ____

خط و کتابت کا پتا

ماہ نامہ ذوق و شوق، پی۔ او۔ بکس: 17984، گلشن اقبال، کراچی۔ پوسٹ کوڈ: 75300
رابطہ نمبر: 021-34990760 ای میل: zouqshouq@hotmail.com
zouq o shouq 0324-2028753

اکاؤنٹ نمبر

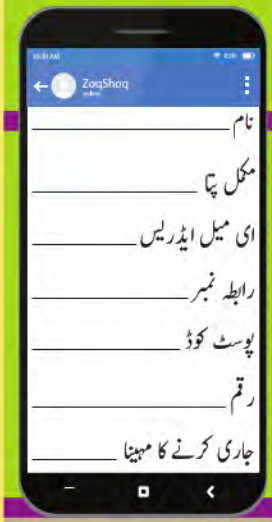

Bank: **Meezan Bank** Title : **Bait ul ilm trust zouq o shouq**
Account Number: **0179-0103431456**
Address: **Soldier bazar branch, Karachi.**

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہ نامہ
ذوق و شوق
کراچی

الحمدللہ! اب تک ماہ نامہ "ذوق و شوق" کے مطالعے سے لگ بھگ پچاس ہزار لوگ کتاب دوست بن چکے ہیں۔

بے لگام کی لگام

محمد حذیفہ رفیق زم زمی۔ کراچی

مصر کا ایک بادشاہ گزرا ہے، جس کا نام تھا: احمد بن طولون۔ اس نے ۲۵۴ھ میں خلافت سنبھالی اور ۲۷۰ھ میں پچاس (۵۰) سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔

احمد بن طولون نے اچھی تربیت پائی تھی، انتہائی دلیر اور بہادر تھا، لیکن اس میں ایک خامی تھی۔ خامی تو ہر انسان میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہی ہے، لیکن وہ ایک ایسی خامی تھی جو بہت سی بُرائیوں اور گناہوں کو جنم دیتی ہے اور پھر بڑے کی خامی بھی بڑی ہوتی ہے۔

احمد بن طولون بہت سی اچھی صفات کے ساتھ غصے کا بہت زیادہ تیز تھا اور غصے میں بے قابو ہو جاتا تھا۔ غصہ ویسے ہی شیطان کی طرف سے ہے اور پھر اختیار اور طاقت بھی جمع ہو جائے تو پھر تو انسان بسا اوقات بہت خطرناک حد تک چلا جاتا ہے۔

اسی وجہ سے اس نے اپنی رعایا پر بے حد ظلم و ستم ڈھایا۔ کئی لوگوں کو اُس نے معمولی جرائم کی بنیاد پر موت کے گھاٹ اتار دیا اور وہ لوگ جنھوں نے اس کے جیلوں میں دم توڑ دیا، اُن کی تعداد اٹھارہ ہزار نقل کی گئی ہے۔

.....☆.....

لیکن ہر دور میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ظالم اور بے لگام بادشاہوں کے سامنے بھی حق بات بولنے سے نہیں گھبراتے، چاہے انھیں اس کی خاطر جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔

چناں چہ اس زمانے کے ایک نیک، خدا ترس، زاہد اور دنیا سے بے رغبت عالم نے بھی احمد بن طولون کا بڑھتا ہوا ظلم و ستم دیکھا تو اُس کے پاس گئے اور اُسے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور ظلم سے بچنے کی نصیحت فرمائی۔

احمد بن طولون اپنی طاقت اور حکومت کے نشے میں مست تھا، اسے ان عالم کی نصیحت انتہائی ناگوار گزری، لہٰذا صرف یہی نہیں کہ اس نے انھیں دھتکار دیا، بل کہ وہ غصے سے بے قابو ہو گیا اور اُن عالم کو عبرت ناک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے حکم دیا کہ انھیں بھوکے شیر کے سامنے ڈال دیا جائے، تاکہ وہ انھیں چیر پھاڑ کر رکھ دے اور مصر کی ساری عوام دیکھ لے کہ احمد بن طولون کے مقابلے پر آنے والے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

.....☆.....

احمد بن طولون کا بیٹا خُمارَوَیْہ خوں خوار شیروں کو پنجروں میں قید کرنے کا شوقین تھا، اس نے جنگلوں میں جا کر کئی شیر زندہ پکڑے تھے۔

اس کام کے لیے اس کے پاس ایک پوری جماعت تھی، جو اپنے پورے جسم پر اُون اور موٹی کھالیں اس طرح اوڑھ لیتے تھے کہ شیر کے پنجے ان پر اثر نہیں کرتے تھے اور اِس طرح ہتھیاروں کی مدد سے وہ سب مل کر زندہ شیر کو پنجرے میں بند کر دیتے تھے۔

احمد بن طولون نے ان عالم کو لقمہ بنانے کے لیے سب سے خطرناک شیر کا انتخاب کیا۔ ایک بڑے میدان میں مضبوط پنجرے میں شیر لایا گیا اور اُن کے سامنے رکھ کر پنجرہ کھول دیا گیا۔

.....☆.....

سارا مجمع دم بخود تھا۔ ہر ایک سانس روکے یہ خوف ناک منظر دیکھ رہا تھا۔ شیر منہ کھولے دھاڑتے اور چنگھاڑتے ہوئے پنجرے سے باہر نکلا اور اپنے نہتے شکار کی طرف بڑھنے لگا۔

دوسری طرف وہ عالم میدان کے بیچ و بیچ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

شیر دھاڑتے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ خوف کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے والوں کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ چند لمحوں کے لیے دلوں کی دھڑکنیں رک سی گئی تھیں۔ رگوں میں خون جم رہا تھا، لیکن میدان میں بیٹھا وہ انسان بہت ہی عجیب تھا، اس نے اب تک نظر اُٹھا کر بھی شیر کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ نہ اس کے جسم پر کپکپاہٹ تھی، نہ اس کے ماتھے پر ایک بل پڑا تھا۔

ان کی یہ اطمینان بھری کیفیت اور پُرسکون حالت دشمنوں کو بے حد چبھ رہی تھی۔ وہ دانت پیسے چلے جا رہے تھے، بزرگ عالم کا یہ اطمینان بھی ان سے نہیں دیکھا جا رہا تھا۔

اور اُن عالم کے ہم نوا اُن کی اس باوقار اور پُرسکون کیفیت سے کسی قدر خوش ضرور تھے، لیکن اس سے بھی کئی گنا زیادہ وہ ان کی قیمتی زندگی کے بارے میں فکرمند تھے۔ وہ ایک جان جس کا بدلہ لاکھوں جانیں نہیں چکا سکتی تھیں، ایک کم عقل بادشاہ کے طیش کی نذر ہونے جا رہی تھی، بھلا حق کے چاہنے والوں کو کیسے یہ گوارا ہوتا!

لیکن تقدیر کے آگے وہ عالم دین اور اُن کے چاہنے والے بے بس تھے، تاہم اسی تقدیر کے مالک کے سامنے احمد بن طولون اور اُس کے ہم نوا ابھی گھٹنے ٹیکتے تھے اور اِسی تقدیر کے رب کے ہاتھ میں ہر ''بے لگام کی لگام'' ہے!

شیر بالکل قریب آ چکا تھا اور اَب دونوں میں صرف ایک بالشت کا فاصلہ رہ گیا تھا، بس اب لمحہ بھر میں محفل ماتم برپا ہو سکتی تھی!

.....☆.....

لیکن اگلے لمحات حیران کن تھے، جس شیر کی زقند کا انتظار تھا، وہی شیر بزرگ کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور پھر اپنا منہ ان کے قریب لے جاتا اور واپس لے آتا، پھر قریب لے جاتا اور پھر واپس لے آتا۔ وہ ان سے ایسے پیار کرنے لگا جیسے کوئی پالتو جانور اپنے مالک کے ساتھ پیار کرتا ہے۔

بزرگ عالم نے ایک لمحے کے لیے سر اُٹھایا، اُسے گھورا اور دوبارہ سر جھکا کر ایسے ہو گئے جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہوں۔

اس کے بعد مزید کچھ دیر شیر اُنھیں اسی طرح پیار کرتا رہا اور پھر واپس پنجرے میں چلا گیا۔

.....☆.....

احمد بن طولون بازی ہار چکا تھا اور کھلی آنکھوں سے بزرگ عالم کی جیت دیکھ چکا تھا اور اُسے یقین آ چکا تھا کہ ان سے مقابلہ کرنا درحقیقت ایک غیبی طاقت سے مقابلہ ہے، جس کی خوش نُودی کی خاطر یہ حق بات کہتے ہیں، چناں چہ جب ان پر کوئی آنچ آنے لگتی ہے تو براہِ راست وہ غیبی طاقت حرکت میں آ جاتی ہے اور ہر مقابل کا راستہ روک دیتی ہے، بل کہ اُسے پاش پاش کر دیتی ہے۔

اس قصے کی کافی شہرت ہوئی اور دُور دُور تک یہ قصہ سنایا جانے لگا۔ ہر نیا شخص اسے افسانے سے زیادہ حیثیت دینے پر آمادہ نہ ہوتا اور جب تک کسی چشم دید گواہ سے اس کا حال نہیں سن لیتا، تب تک اسے یقین نہ آتا۔

.....☆.....

باقی جب شیر اپنا منہ ان کے قریب لے جا رہا تھا، اُس وقت وہ کسی گہری فکر اور سوچ میں نظر آ رہے تھے، اب اس بارے میں چہ مگوئیاں ہونے لگی تھیں۔

کوئی کہہ رہا تھا: ''خوف اور دہشت سے وہ بے خود ہو چکے تھے!''

کسی کی رائے تھی: ''وہ موت کے لیے پوری طرح تیار ہو چکے تھے اور دُنیا سے بے خبر ہو چکے تھے۔''

کسی نے کہا: ''وہ اپنے آپ کو کسی گہری سوچ لے گئے تھے، جس کی وجہ سے ان کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا تھا!''

بہت سے لوگوں کا تو یہ خیال تھا کہ یہ ان بزرگ عالم دین کی ایک مخصوص کیفیت تھی، جس کا شیر پر بھی غیر معمولی اثر ہوا اور وہ سکتے میں آ گیا۔

بہر حال، اس طرح کی بہت سی باتیں زبانوں پر آ رہی تھیں۔

اور الحمدللہ! وہ زندہ سلامت، باعزت، بل کہ پہلے سے زیادہ کئی گنا معزز و مکرم میدان سے باہر آ چکے تھے، اس لیے ان سے یہ پوچھا جا سکتا تھا۔

چناں چہ جہاں دوسرے لوگ ابھی تک اس جستجو میں تھے، احمد بن طولون کو بھی اس تجسس نے بہت بے تاب کر رکھا تھا کہ آخر وہ کیا کیفیت تھی جب شیر اُن کے بالکل قریب جا کر اُنھیں سونگھ رہا تھا۔ اس نازک موقع پر بھی اُن پر ایک گہری سوچ سوار تھی۔ آخر وہ ایسی کون سی بات اور کیا فکر تھی کہ موت کے منہ میں وہ اس میں محو تھے؟

احمد بن طولون نے سوال کر ہی ڈالا:

مَا الَّذِی کَانَ فِی قَلْبِكَ حِینَ شَمَّكَ السَّبُعُ؟

(جب شیر آپ کو سونگھ رہا تھا اس وقت آپ کس سوچ میں تھے؟)

عالم دین نے برجستہ جواب دیا:

کُنْتُ أَتَفَکَّرُ فِی سُؤْرِ السِّبَاعِ وَلُعَابِهَا!

(میں سوچ رہا تھا کہ شریعت میں درندے کے جھوٹے اور اُس کے تھوک کا کیا حکم ہے، آیا وہ پاک ہے یا ناپاک!؟)

سبحان اللہ! یہ کمال کی بے نیازی، توکل کی انتہا اور یقین کی معراج تھی کہ جس اللہ کے حکم کی خاطر اور جس دین کی ناموس کے واسطے انھیں اس آزمائش کا سامنا کرنا پڑا تھا، انھیں اس پر دنیا اور آخرت میں نجات ملنے کا اتنا زیادہ یقین اور بھروسا تھا کہ وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ اگر جان جاتی ہے

بقیہ صفحہ نمبر 94 پر

جاؤ کام کرو

الطاف حسین۔ کراچی

ابا جان کے حکم نے ہمیں ذہنی کوفت اور چڑچڑے پن کا شکار بنا دیا تھا۔ اب نہ ہمیں کھانے میں مزہ آتا تھا، نہ سونے میں اور نہ ہی کھیلنے کے لیے گراؤنڈ جانے کا دل کرتا تھا۔ نیند میں بھی کوئی خواب کی صورت میں ہمیں انتہائی ڈراؤنی آواز میں حکم دیتا:

''جاؤ کام کرو، مفت کی روٹیاں بہت توڑ لیں۔ اب جاؤ کوئی کام کرو۔ جاؤوووووو..... جاؤوووووو، میں کہتا ہوں جاؤوووووو..... جاؤوووووو، کام کرو۔'' اور ہم خوف سے کانپتے ہوئے یک دم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے اور اس کے بعد ہمیں بہت مشکل سے دوبارہ نیند آتی۔

جب کئی دن اور کئی راتیں اسی ''حال'' میں گزر گئیں تو ہمیں اپنا ''مستقبل'' خطرے میں دکھائی دینے لگا۔

ایک دن ہم نے ہمت پکڑی اور دُکھوں کی گٹھڑی اُٹھائے یہ سوچتے ہوئے دادا جان کے کمرے کی طرف چل دیے کہ شاید اُن کی نظرِ کرم اور مداخلت سے ہماری یہ مشکل ''مسئلہ کشمیر'' کی طرح اِلتوا کا شکار ہو جائے اور ہم چند دن اور سکون سے جی لیں۔

ہم دادا جان کے کمرے میں داخل ہوئے اور آداب بجالانے کے بعد اُن کے ''رُوبرو'' دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔

''کہیے برخوردار! کیسے آنا ہوا؟'' دادا جان نے پان کا بُھرکس نکالتے ہوئے ہماری آمد کا مقصد پوچھا۔ ان کے لب مبارک جو کھلے تو اُن کے منہ مبارک میں جمع شدہ ''کتھئی مواد'' ''پھرچ'' کی آواز کے ساتھ ہمارے دامن پر آ گرا۔ ہم نے جلدی سے دامن اُلٹ کر دادا جان کی ''نوازش'' کو چھپایا اور ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔

''چچ چچ چچ چچ..... کیا ہوا میرے لال کو!؟ بولتا کیوں نہیں؟ کیا دُکھ ہے تجھے؟ مجھے بتا بیٹا! اگر معاملہ گھر سے تعلق رکھتا ہے تو میں فوراً ''کلیئر'' کر دوں گا۔''

دادا جان ہمیں گلے سے لگا کر پچکارتے ہوئے بولے۔

''دادا جان! وہ لوگ ہمیں کہتے ہیں: 'جاؤ کچھ کام کرو'۔'' ہم نے رو دینے والے انداز میں اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

''یہ 'وہ لوگ' کون ہیں؟'' دادا جان نے ہمیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

''ابا جان، امی جان اور باجی۔'' ہم نے لمحہ ضائع کیے بغیر فہرست پیش کر دی۔

''یہ سب تمھیں کہتے ہیں کہ جاؤ کام کرو؟'' دادا جان بولے۔

''جی، پہلے ابا جان نے کہا، اس کے بعد امی جان نے اور اَب باجی نے بھی اُن کی طرف داری شروع کر دی ہے۔'' ہم نے جلتی پر تیل ڈالا۔

''ارے، ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے۔ برخوردار! ابھی تو تمھارے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ کام کرنے کے لیے تو بیٹا جی! ابھی عمر پڑی ہے۔ اللہ بخشے تمھارے پَردادا اور ہمارے ابا جان کو، اُنھوں نے ہمیں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بائیس سال کی عمر تک تو گھر سے ہلنے تک نہیں دیا تھا اور تجھے تیرے ابا کہتے ہیں کہ جاؤ، کام کرو۔'' دادا جان کے چہرے پر یہ کہتے ہوئے بالترتیب ہم دردی، فخر اور غصے کے تاثرات اُبھرے۔ ہم دردی ہمیں نصیب ہوئی۔ فخر ہمارے پَردادا کے حصے میں آیا اور غصے کا اندراج ابا جان کے ''کھاتے'' میں کر دیا گیا۔

''اچھا دادا جان! اب میں جاؤں؟'' کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ہم نے اجازت چاہی۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں، بالکل جاؤ اور کھیلو کودو، مزے اڑاؤ!'' دادا جان نے ہمیں فراخ دلی سے جانے کی اجازت دی اور ہمارے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے ''خوش خبری'' سنائی کہ بے غم ہو کر جاؤ، اب تم نے اپنا ''کیس'' ہماری عدالت میں پیش کر دیا ہے اور اِن شاء اللہ! فیصلہ تمھارے ہی حق میں ہوگا۔''

اس دوران میں ہم ماتھے سے ٹھوڑی تک ایک بار پھر ''پیک آلودہ'' ہو چکے تھے، لیکن آزادی ملنے کی خوشی میں ہم ایک بار تو کیا، دس بار ''پیک آلودہ'' ہونے کو تیار تھے۔

ہم دادا جان کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آئے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اپنے بستر پر لیٹ کر ایک دل چسپ ناول پڑھنا شروع کیا۔ ابھی ہمیں اپنے کمرے میں آئے بمشکل بیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ باجی تیزی سے ہمارے کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں:

''تمھیں دادا جان بلا رہے ہیں۔'' ہم باجی کے ہم راہ دادا جان کے حضور پیش ہو گئے۔ ''فاصلہ رکھیں!'' کے مصداق اُن سے ذرا دُور ہی کھڑے ہوئے، کیوں کہ بُرا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔

''جی دادا جان! آپ نے ہمیں بُلایا ہے؟'' ہم نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

دادا جان نے جواب دینے کے بجائے ہمیں سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا اور پھر دعا سلام کے بغیر ہمیں اکیس عدد ''صلواتوں'' کی سلامی دے ماری۔ ہم ابھی اس ''نوازش'' سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ اپنے بستر سے اُٹھ کر تیزی سے ہمارے قریب آئے اور ہمارے کان اپنے ''دستِ

شفقت'' سے مروڑتے ہوئے گرامر سے پاک صاف لفظوں کا ایک زوردار برسٹ مارا اور ہمارا چہرہ سرخ ہوگیا۔ (شرم سے نہیں، پان کی پیک سے)۔

''ارے کم بخت! تُو کہتا ہے کہ کام نہیں کرے گا۔ کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا!'' دادا جان جذبات کی رو میں بہتے چلے گئے۔

''یا الٰہی! یہ کیا ماجرا ہوگیا؟ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل ہرا کیسے ہوگیا؟ ذرا سی دیر میں یہ کیا ہوگیا زمانے کو؟'' ہم رومال سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے سوچ کے تانے بانے میں بُری طرح اُلجھ گئے۔

''ارے اُلّو! بولتا کیوں نہیں؟ کیا سانپ سونگھ گیا ہے تجھے ے ے ے ے.....؟'' دادا جان ''تجھے'' کی ''ے'' کو قدرے کھینچتے ہوئے غصے سے گرجے اور ہمارا ننھا سا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، لیکن اس وقت بھی ہم یہ سوچ رہے تھے کہ تھوڑی دیر پہلے تو یہی دادا جان تھے جو ہم پر ہم دردی کے پھول نچھاور کر رہے تھے اور صرف بیس منٹ میں اُنھوں نے کتنی دیدہ دلیری سے اپنے سارے ''خُلوص کا جوس'' نکال کر رکھ دیا تھا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے ہمارے کسی ''دشمن'' نے ہمیں دادا جان سے ''مذاکرات'' کرتے دیکھ لیا ہو اور بات ''اُوپر'' تک پہنچا دی ہو اور پھر پوری ٹیم نے مل کر دادا جان کے چھوٹے چھوٹے کان ہمارے خلاف بھر دیے ہوں۔ ہاں، بالکل یہی ہوا ہوگا، اسی لیے تو دادا جان کے رویے کی گنگا اُلٹی بہہ رہی ہے۔

''ارے، کچھ منہ سے بھی پھوٹ! کیا تیرا سامان سے لدا جہاز غرق ہوگیا ہے؟ بول، تُو کیوں کام نہیں کرے گا؟'' دادا جان اپنی چھڑی کا مُڑا ہوا سِرا ہماری چھوٹی سی گردن میں پھنساتے ہوئے نہایت غصے سے بولے۔

اسی اثنا میں گھر کے دوسرے ممبران بھی ہماری بے بسی کا ''مفت'' تماشا دیکھنے کی غرض سے دادا جان کے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔

قصہ مختصر، دادا جان کی بات سننے اور اگلے روز سے کام تلاش کرنے کا وعدہ کرنے کے بعد ہم صفر پر آؤٹ ہونے والے کھلاڑی کی طرح مایوسی کی حالت میں بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے ان کے کمرے سے باہر نکل آئے اور اپنے کمرے میں جا کر دیر تک دادا جان کے منفی رویے، اپنی رسوائی اور بے بسی پر خاموش ماتم کرتے رہے۔

اگلے دن صبح فجر کی نماز پڑھ کر اللہ کے حضور گڑگڑا کر اپنی فتح کی دعا کی اور خود کوئی کام شروع کرنے کے بجائے نوکری کرنے کو ترجیح دی۔ ناشتے سے فارغ ہوکر ہم سیدھے مسکین نائی کی دکان پر پہنچے۔ اخبار آچکا تھا۔ ہم نے اخبار اٹھایا اور اُس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ فلاں سیاست دان بیرون ملک دورے پر کیوں گیا ہے؟ فلاں سیاست دان کو کس جرم کی پاداش میں ''نظر بند'' کر دیا گیا ہے؟ فلاں سیاست داں دیکھتے ہی دیکھتے ''لوٹا'' کے نام سے کیوں مشہور ہوگیا ہے؟ ڈالر کے مقابلے میں پاکستانی روپے کی قدر کیوں کم ہوگئی ہے؟ سونے اور چاندی کا بھاؤ کیوں بڑھ رہا ہے؟ پاکستان کی کرکٹ ٹیم بعض اوقات جیتا ہوا میچ کیوں ہار جاتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ، ان جیسی خبروں سے ہمیں کوئی غرض نہیں تھی۔ ہماری دل چسپی کا محور تو صرف اشتہارات کا صفحہ تھا۔ ہم نے مذکورہ صفحے کو اچھی طرح دیکھا، لیکن مطلب کی کوئی اسامی کسی کالم میں دکھائی نہ دی تو کل کی اُمید پر گھر لوٹ آئے۔

بالآخر مسکین نائی کی دکان پر مسلسل حاضری کے پانچویں دن اشتہاری صفحے کا مشاہدہ کرتے ہوئے ہماری نظریں ایک اشتہار پر آ کر ٹھہر گئیں۔ مطلب کا اشتہار دکھائی دینے پر پہلے تو ہم نے خوشی سے عملاً بغلیں بجائیں اور پھر اِشتہار دینے والے ادارے کا پتا نوٹ کیا۔ مختصر وقت میں ''کاغذی کارروائی'' مکمل کر کے حوالہ ڈاک کر دی اور اُنگلیوں کے پوروں پر اِنتظار کے دن گننا شروع کر دیے۔

چوبیس دن بعد ہمیں کلرک کے انٹرویو کا ''کال لیٹر'' موصول ہوگیا اور یہ ناقابلِ یقین خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے خاندان کے کانوں تک پھیل گئی۔ اس کے بعد ہمارے انتخاب کے حوالے سے کُھسر پُھسر کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ کوئی کہتا: ''بھئی سیکنڈ ڈویژن میں انٹر پاس کرنے والے کا منتخب ہونا بہت مشکل ہے۔'' کوئی نفی میں سر ہلاتے ہوئے یوں گویا ہوتا: ''ہمیں تو کسی طور بیل منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی۔'' اور کوئی ہمارے حق میں یہ حوصلہ افزا بیان جاری کرتا: ''اگر اللہ تعالیٰ نے صاحب زادے کا رزق اس محکمے میں لکھ دیا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے رستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی، کیوں کہ ''آوازِ سگاں کم نہ کند رزق گدارا!'' (کتوں کے بھونکنے سے فقیروں کے رزق میں کمی نہیں آتی)۔

بالآخر وہ دن آ ہی گیا جس دن ہم صبح سویرے اللہ کو یاد کرتے ہوئے حصولِ روزگار کی اس کٹھن مہم کو سَر کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ پتا پوچھتے پوچھتے نو بجے اپنے ہونے والے دفتر پہنچے۔ انٹرویو کے کمرے سے مرکزی دروازے تک اُمیدواروں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ ہم نے بھی اپنا ''جسدِ خاکی'' اس قطار سے ''نتھی'' کر لیا۔

''یہ قطار کیوں نہیں چل رہی ہے؟'' ہم سے آگے کھڑے اُمیدوار

نے اپنے سے آگے کھڑے اُمیدوار سے قطار میں پیدا ہونے والی رکاوٹ کا سبب پوچھا۔

''یار! افسر صاحب ہی ابھی تک دفتر نہیں پہنچے، جو ہمارا انٹرویو کریں گے۔'' جواب میں تلخی کی جھلک نمایاں تھی۔

''یار! یہ افسر لوگ مقررہ وقت پر دفتر تشریف کیوں نہیں لاتے؟'' دوبارہ سوال کیا گیا۔

''وہ جب آئیں گے تو اُنھی سے پوچھ لینا۔'' دوبارہ تلخی سے بھرپور جواب دیا گیا۔

ہم ان دونوں کے باہمی تبادلہ خیال پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ قصہ مختصر، پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق ٹھیک دس بج کر بیس منٹ پر افسر نے اپنے دفتر کو رونق بخشی اور تیس چالیس منٹ تک ''ستانے'' کے بعد انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے قطار سرکتی جا رہی تھی۔ ہمیں ایک بج کر دس منٹ پر اَفسر کے دَر تک رسائی نصیب ہوئی۔

''ارے ٹھہرو! بہت جلدی ہے کیا؟ دیکھتے نہیں، ابھی ایک اندر ہے۔'' ہم نے جیسے ہی اندر جانے کے لیے قدم بڑھایا دفتر کے باہر تعینات مخروطی شکل والے چپڑاسی نے ''اخلاق'' کا مظاہرہ کیا۔ اس کے لہجے سے افسر سے قربت کا ''ہامانی غرور'' جھلک رہا تھا۔

''جاہل کی بات کو برداشت کرنا عقل کا صدقہ ہے۔'' غصے سے بل کھاتے ہوئے ہمیں اچانک ایک دانش مند کا قول یاد آ گیا اور ہم صبر کے گھونٹ بھر کر رہ گئے۔

''اوئے شیدے! اِدھر آ۔'' چپڑاسی نے سامنے نیم کے درخت تلے اکڑوں بیٹھے شخص کو اپنے ''مخصوص'' انداز میں پکارا۔

''کیا بات ہے؟'' رشید عرف شیدا، چپڑاسی کے قریب آ کر بولا۔

''یار! ذرا اِدھر کھڑا ہو جا، میں ایک چھوٹا سا کام کر کے آتا ہوں۔ صاحب پوچھے تو کہنا: ''واش روم'' گیا ہے۔'' چپڑاسی، شیدے کو ''سمجھا کر'' لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مرکزی دروازے سے باہر نکل گیا۔

''یہ بھی سارے کام دفتری وقت میں ہی کرتا ہے۔'' شیدے نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''کس کی پرچی لائے ہو؟'' چند منٹ بعد شیدا ہم سے مخاطب ہوا۔

ہم نے جواب دینے کے بجائے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اُٹھا دی۔

''اچھا.....!'' شیدے نے ہمیں حیرت سے دیکھتے ہوئے ہمارے یقین پر طنز کیا۔

''کتنے کھلائے ہیں؟'' شیدے نے چند لمحے سوچنے کے بعد دوبارہ سرگوشی کی۔

''کیا؟'' ہم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''پیسے بھائی جی! سکہ رائج الوقت۔'' شیدے نے دوبارہ سرگوشی کی۔

''کسی کو ایک دھیلا بھی دیا ہو تو حرام ہے۔'' ہم نے موصوف کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔

''اُستاد! حیرت کی بات ہے، نہ پرچی نہ خرچی، پھر بھی قطار میں کھڑے ہو! یہ پیسے اور سفارش کا دور ہے میاں! اگر مال نہیں ہے تو کسی تگڑے وزیر کو پکڑو، ایسے کام ہو جائے گا۔'' شیدے نے چٹکی بجاتے ہوئے انکشاف کیا۔

''اللہ نے جسے علم کی دولت سے نوازا ہو اُسے رشوت اور سفارش کی بیساکھیوں کے سہارے چلنا زیب نہیں دیتا۔'' ہم نے ایک بار پھر شیدے کے دلائل کی نفی کی۔ ابھی شاید تبادلہ خیالات کا سلسلہ کچھ دیر اور چلتا کہ اچانک دفتر کی چک اٹھی اور ایک امیدوار کپکپاتی ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری تھی۔ پورا جسم پسینے سے شرابور تھا اور ہاتھ میں پکڑی کارہائے نمایاں کی فائل سے دستاویزات بے ترتیب انداز میں باہر جھانک رہی تھیں۔ ہم اس کی حالت دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہمارا بھی چند لمحوں میں اُسی جیسا حال ہو گیا۔

''چلو میاں! جاؤ اندر۔'' شیدے نے ہمیں معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ''حکم'' دیا اور ہم اس کی تعمیل میں بے ڈھنگے انداز میں چلتے ہوئے دفتر میں ''اِنٹر'' ہوئے اور اَفسر کو اپنا ''وِیو'' پیش کر دیا۔

''اَس.....سلا.....مُ.....عَلَی.....کُم!'' ہم نے تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکل سے سلام کیا۔

افسر نے سر کی ہلکی سی جنبش سے سلام کا جواب دیا اور پھر سر اور آنکھوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہمیں اپنے رُوبرُو بیٹھنے کا سگنل دیا۔

''کیا نام ہے تمھارا؟'' افسر نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ال.....ال.....طا.....طاف.....ح.....حس.....سین۔'' ہم نے بوکھلاتے ہکلاتے اپنا نام بتایا۔

''پہلی بار قسطوں میں نام سننے کا اتفاق ہوا ہے!'' افسر ہماری فائل کھول کر اُس کے اندر موجود کاغذات دیکھتے ہوئے بولا۔ ایک طرف

موصوف کی چبھتی ہوئی نظریں تھیں اور دوسری طرف ہم اپنی ''گھبریلی'' طبیعت اور لرزتی ٹانگوں سے برسرِ پیکار تھے، لیکن صاحب! امتحان اور انٹرویو ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ دونوں کے وجود میں آنے پر انسان کی نہ گھبراہٹ کم ہوتی ہے، نہ ٹانگیں لرزنے سے توبہ کرتی ہیں اور نہ ہی دھڑکتے دل کو قرار آتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی اس وقت یہی معاملہ تھا۔

''ابھی سے تمھاری یہ حالت ہے۔'' افسر نے کہا۔

''نن..... نہ..... نہیں..... و..... وو..... وہ..... ذ ذ..... ذ ذ..... ذ را.....''

ہم نے گھبرا کر جملہ ادھورہ چھوڑ دیا۔

''ڈرو نہیں، میں تمھیں کھا تو نہیں رہا۔'' افسر نے طنز کا نشتر چلایا۔

''نن..... نن..... نہیں..... سس..... سس..... سر! وہ آپ.....'' ہم نے گھبرا کر دوبارہ جملہ ادھورہ چھوڑ دیا۔

''بھئی کہہ جو دیا ہے کہ میں تمھیں کھاؤں گا نہیں۔ اب انٹرویو کے لیے تیار ہو؟'' افسر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہم سے پوچھا۔

''جج..... جج..... جی ہاں، مم..... مم..... میں تت..... تت..... تیار ہوں۔''

ہم نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا سنو، جو سوال میں پوچھوں گا تمھیں اس کا جواب خوب سوچ سمجھ کر دینا ہے۔'' افسر نے نہایت دوستانہ انداز میں کہا اور ہماری گھبراہٹ قدرے کم ہوگئی۔

''ٹھیک ہے سر!'' ہم نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''کوئی گیم وغیرہ کھیلتے ہو؟'' افسر نے ہم سے ذاتی سا سوال کیا۔

''جی ہاں، کیوں نہیں! میں لوڈو کا ایکسپرٹ پلیئر ہوں۔ پرسوں کی بات ہے میں نے اپنے کزن شفیق کو دو ''سوکھی'' اور چار ''گیلی'' بازیاں ہرا کر شمسو کے ہوٹل پر روسٹ مرغی اُڑائی تھی!'' ہم نے جواب دینے کے بعد افسر کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا، لیکن جوابی گیند عقل کو ''ڈاج'' دیتی ہوئی زوردار دھماکے سے ''گول'' سے جا ٹکرائی اور مطلع ''ابر آلود'' ہوگیا۔ اگلے لمحے افسر کی طرف سے سخت لفظوں کی زوردار بارش ہونے لگی:

''میں سوال کیا کر رہا ہوں اور تم جواب کیا دے رہے ہو۔ اگر ہم نے تمھیں ''یو۔ڈی۔سی'' (اپر ڈویژن کلرک) بھرتی کر لیا تو محکمہ دیکھتے ہی دیکھتے دیوالیہ ہو جائے گا۔'' افسر غصے سے بولا۔

''تم جیسا ''لیٹو'' افسر اس محکمے میں بھرتی ہو سکتا ہے تو ہم جیسا کلرک کیوں بھرتی نہیں ہو سکتا؟'' ہم نے دل ہی دل میں خود کلامی کی۔

''سر! آپ نے مجھ سے کھیل کے بارے میں پوچھا تھا، جو کھیل میں کھیلتا ہوں میں نے اس کے بارے میں سچ سچ بتا دیا سر! کیا ''لوڈو'' کھیل نہیں ہے؟'' ہم نے وضاحت طلب نگاہوں سے افسر کی طرف دیکھا۔

''ہاں، ہے تو سہی۔'' افسر نے نہ چاہتے ہوئے بھی اقرار کر لیا۔

''اچھا، اب یہ بتاؤ کہ تمھارے مشاغل کیا کیا ہیں؟'' اس بار افسر کا لہجہ خاصا نرم تھا۔

''سر! کوئی ایک مشغلہ ہو تو بتاؤں۔ میں نے بیک وقت کئی مشغلے پال رکھے

ہیں!'' ہم نے کہا۔

''مثلاً کیا کیا؟'' افسر تجسّس بھرے انداز میں بولا۔

''کیری کیچر جمع کرنا، کارٹون جمع کرنا، لطیفے جمع کرنا، منی بسوں اور بسوں کے اندر لکھے ''خصوصی'' اقوال پڑھنا اور پھر ڈائری میں ان کا باقاعدگی سے اندراج کرنا۔ محلے کی دکانوں پر خریداری کرنے والے ہم عمر گاہکوں کے پیچھے دُم باندھنا اور رات کو سوتے ہوئے اُٹھ کر ''نائٹ واک'' کرنا اور......اور......'' ہم کہتے کہتے سانس لینے کے لیے رُکے تو اَفسر کے جسم میں ۲۲۰ کے بجائے ۱۱۰۰۰ وولٹ کا کرنٹ دوڑنے لگا اور وہ اس وقت تک ''اسپارکنگ'' کرتے رہے جب تک ان کا ''فیوز'' نہیں اُڑ گیا۔

''تم......تم جاسکتے ہو۔ تم اس پوسٹ کے لیے قطعی طور پر ناموزوں ہو۔ آئی سے ے ے ے...... یُو کین گووووو!'' یہ آخری اسپارک تھا جس کی تاب نہ لاتے ہوئے ہم خاموشی سے اُٹھے، نظر بھر کر غصے سے ادھ موئے ہوتے ''افسر'' کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے چلتے ہوئے دفتر سے باہر نکل آئے۔ اب بھی چھ درجن سے زائد ''مستقبل کے معمار'' قطار میں کھڑے ''اُمید'' پر ''واری'' ہونے کے منتظر تھے۔ ہم نے ان پر ایک ہمدردانہ نظر ڈالی اور ''ڈَک بلّے باز'' کی طرح آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ادارے کے مرکزی دروازے سے باہر نکل آئے۔ ہمارے ذہن میں شیدے کی بات گھوم رہی تھی:

''اس دور میں پرچی یا خرچی کے بغیر نوکری حاصل کرنا بہت ہی مشکل ہے!''

بقیہ: بے لگام کی لگام

تو چلی جائے، لیکن دین کا کوئی معمولی حکم بھی فراموش کرنے پر ہم راضی نہیں۔ بل کہ اپنی موت کو اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر بھی دین کے ایک چھوٹے سے مسئلے سے غافل نہیں ہوئے، بل کہ اسی کی سوچ و فکر میں مگن رہے۔

یہ تو وہ وقت ہوتا ہے جب آدمی اپنے حواس میں ہی نہیں رہتا، اپنی جان سے بڑھ کر کیا ہے جو یاد آئے، لیکن حقیقت میں شریعت کے احکام ان کی نظر میں اپنی جان سے بھی بڑھ کر تھے، اس لیے وہ اس وقت بھی شریعت کے مسئلے کی فکر میں مصروف رہے۔

......☆......

کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ عالم دین کون تھے؟

ان کا نام ہے: اَبُو الْحَسَن بُنَان بن مُحَمَّد حَمّال رحمۃ اللہ علیہ!

یہ بہت بڑے امام، شیخ الاسلام، محدث اور زاہد تھے، ان کی عبادت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔

ان کا آبائی علاقہ واسط تھا۔ بغداد میں زندگی گزاری، وہیں حدیث کا علم حاصل کیا اور آخر عمر میں مصر منتقل ہو گئے۔ مصر میں ہی رمضان ۳۱۶ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے جنازے میں سارا مصر اُمڈ آیا تھا، لوگوں کے ہجوم کا عجیب عالم تھا۔

(ماخوذاز: حلية الأولياء: ۱۳/۳۲۴-تاريخ بغداد: ۷/۱۰۴-صفة الصفوة: ۱/۴۹۶-وحی القلم: ۵۸۵۰/۳)

سوال آدھا، جواب آدھا ⓫ کے درست جوابات

1. سورۂ یٰسٓ۔
2. حضرت سارہ علیہا السلام۔
3. آپ کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام۔
4. 3 ہجری۔
5. خاندان تغلق (دور حکومت 1320ء تا 1412ء)۔
6. برطانیہ۔
7. اُزبک قوم کی مناسبت سے۔ (نوٹ: ''ازبک'' قوم ترک نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس قوم کا نام عالمی شہرت یافتہ ''سنہری'' (لشکر گولڈن ہورڈز) کے سپہ سالار امیر اُزبیک خان کے نام سے منسوب ہے۔ ''سنہری لشکر'' کو اہل یورپ ''ارتھ شیکرز'' (زمین ہلا دینے والے) کے نام سے پکارتے تھے)۔
8. 5 دسمبر۔
9. کرکٹ۔
10. کسی کی بُرائی کرنا۔

سوال آدھا، جواب آدھا ❿ کے درست جوابات

1. سورۂ فتح، سورۂ جن، سورۂ دہر اور سورۂ شمس۔
2. حضرت ادریس علیہ السلام۔
3. پچاس ہزار نمازوں کے برابر۔
4. حضرت خطاب رضی اللہ عنہ۔
5. ایام حج میں احرام اتارنے کے بعد حاجیوں کا بال کتروانے کا عمل ''تقصیر'' کہلاتا ہے۔
6. خطوط کا یہ مجموعہ بھی مرزا اسد اللہ خان غالب کا تحریر کردہ ہے۔
7. مغربی افریقہ۔
8. آئرن سلفیٹ۔
9. 454 گرام۔
10. اپنا کام خود اپنے ہاتھ کرنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

☆ جسے ہارنے کا خوف ہو وہ ضرور ہار جاتا ہے۔

☆ عقل مند وہ ہے جسے غصہ دیر سے آتا ہے۔

☆ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ بدلہ نہیں لیتا۔

☆ انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا پیٹ ہے۔

☆ وقت اور سمندر کی موجیں کسی کا اِنتظار نہیں کرتے۔

☆ معافی مانگنا آسان ہے، پَر گناہ چھوڑنا مشکل۔

(محمد عمر باڑی۔کراچی)

☆ محنت کرنے سے جسم تن درست، دماغ پُرسکون، دل فیاض اور جیب بھری رہتی ہے۔

☆ ایک شخص بن کر نہ جیو، بل کہ ایک شخصیت بن کر جیو، کیوں کہ شخص تو مر جاتا ہے، مگر شخصیت ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

(محمد احمد اسلم، محمد عزیز اسلم۔کراچی)

☆ ہم نے خدا کو پہنچانا، مگر اُس کی معرفت کا حق ادا نہیں کیا۔

ہم نے قرآن پڑھا، مگر اُس پر عمل نہ کیا۔

ہم نے رسول سے محبت کی، مگر سنت پر عمل نہ کیا۔

ہم نے شیطان سے دشمنی کا دعویٰ کیا، مگر اُس کی مخالفت نہ کی۔

ہم نے جنت کی خواہش کی، مگر اُس میں داخل ہونے کا سامان نہ کیا۔

ہم نے جہنم سے پناہ مانگی، مگر خود ہی اپنے آپ کو اس میں ڈالنے کا سامان کیا۔

ہم نے موت کو حق جانا، مگر اُس کے لیے تیاری نہ کی۔

ہم نے دوسروں کی عیب جوئی کی، مگر اپنے عیب نہ دیکھے۔

ہم نے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھائیں، مگر اُس کا شکر ادا نہ کیا۔

ہم نے مُردوں کو دفن کیا، مگر عبرت حاصل نہ کی۔

☆ اگرچہ انسان کو مقدر سے زیادہ رزق نہیں ملتا، لیکن رزق کی تلاشی میں سستی نہیں کرنی چاہیے۔

☆ جو شخص دوسروں کے غم سے بے غم رہے، آدمی کہلانے کا مستحق نہیں۔

☆ اگر چڑیوں میں بھی اتحاد ہو جائے تو وہ شیر کی کھال اُتار سکتی ہیں۔

(سمیہ بنت شوکت علی۔ٹنڈو آدم)

☆ دوستی ایک برف کے گولے کی مانند ہے، جسے بنانا تو آسان ہے، مگر برقرار رکھنا بہت مشکل ہے۔

☆ زندگی کو برسوں سے نہیں، اچھے اعمال سے ناپو۔

☆ جنت کا شوق اور جہنم کا خوف ہو تو شریعت پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔

☆ جس نیکی میں تعریف اور اِنعام کی خواہش نہ ہو وہ عظیم نیکی ہے۔

☆ اپنے آپ کو طالب علم سمجھو، اگرچہ علم کا پہاڑ ہی کیوں نہ بن جاؤ۔

(علشبہ بنت محمد مبین۔ٹنڈو آدم)

☆ وہ دین کسی کو کیا نقصان پہنچائے گا جس میں راستے سے پتھر ہٹانے پر بھی ثواب ملتا ہے۔

☆ لوگ تمھارے کارنامے دیکھتے ہیں اور رب تمھاری نیتیں دیکھتا ہے۔

(حافظ ام رومان عمر دراز۔نواب شاہ)

☆ زندگی میں اپنا پن تو ہر کوئی دکھاتا ہے، لیکن اپنا کون ہے؟ یہ وقت بتاتا ہے۔

☆ دنیا میں اچھوں کے ساتھ اچھے رہو، لیکن بُرے کے ساتھ بُرے مت بنو۔

(حافظہ اریبہ خان۔نواب شاہ)

قارئین بکھرے موتی

پانی

روبینہ ممتاز روبی۔ کراچی

زندگی کے جو چار ہیں ''ایلیمنٹ''
ایک جز اس کا پر جو پانی ہے
کون سی جا نہیں ہے یہ موجود
''پروٹوپلازم'' کا ''میجر کومپونینٹ''
ہے رواں خوں بہ جسمِ انسانی
تم جو لیتے ہو بارشوں کا مزہ
گو ہے خطرہ یہ صورتِ سیلاب
تیرتی برف کیوں ہے پانی پر
''آنسر'' اس کا سیدھا سادہ ہے
یہ بھی ہے اک کرشمہ پانی کا
لمحہ بھر کے لیے جو سوچو تم
قدر کرتے ہیں نعمتوں کی وہی

گرچہ سب ہی بہت ہیں ''امپورٹنٹ''
اہمیت اس کی سب نے مانی ہے
آسماں تا زمیں ہے اس کا وجود
کام اس کا بہت ہے ''امپورٹنٹ''
اس کا بھی ذمہ دار ہے پانی
جان لو اس کی اہمیت بھی ذرا
اس میں جیتی ہے پر حیاتِ آب
غور تھوڑا کرو اگر اس پر
پانی کی ''ڈینسٹی'' زیادہ ہے
اس سے ہوتی ہے برقی رو پیدا
پانی کو بے سبب نہ پھینکو تم
جن کو نعمت کوئی ملی نہ کبھی

پانی کی اہمیت کو جانو تم
بات میری ذرا جو مانو تم

انگریزی الفاظ اور اُن کے معانی:

۱ ایلیمنٹ (Element): عنصر
۲ امپورٹنٹ (Important): اہم
۳ پروٹوپلازم (Protoplasm): مادۂ حیات
۴ میجر کومپونینٹ (Major Component): اہم اجزا
۵ آنسر (Answer): جواب۔
۶ ڈینسٹی (Density): کثافت/گاڑھا ہونا

Kio's

Collection shoes

New Arrivals
Now At Store

ذوق وشوق
میگزین ساتھ لانے
پر اسپیشل
10%
ڈسکاؤنٹ

اسکول شوز ہر سائز میں۔۔۔ چھے ماہ کی گارنٹی کے ساتھ۔۔۔

Shop No. 9, Star Centre, Near Chawla Centre,
Main Tariq Road Karachi. Ph: 021-34315359

NEW OPENING
HAND BAGS
20% OFF

She shoes

New Arrivals
Now At Store

Shoes for ladies and kids

10% OFF
ON ALL DISPLAY
ITEMS
LIMITED TIME OFFER

SCHOOL SHOES & PT SHOES
AVAILABLE ONLY 790/=

FANCY CLUTCH
& WALLET

ذوق وشوق
میگزین ساتھ لانے
پر اسپیشل
10%
ڈسکاؤنٹ

Shop No. 14-15, Lavish Mall, Opp. Rabi center,
Main Tariq Road, Karachi. Tel.: 0213-4547778, 0213-34327331

کوپن برائے

بلاعنوان ۱۵۹

نام: _____ ولدیت: _____

مکمل پتا: _____

فون نمبر: _____

کوپن برائے

ذوقِ معلومات ۵۸

نام: _____ ولدیت: _____

مکمل پتا: _____

فون نمبر: _____

سوال آدھا ۱۴ جواب آدھا

نام: _____ ولدیت: _____

مکمل پتا: _____

فون نمبر: _____

کوپن برائے

بچو! اس کا نام بتانا ۵

نام: _____ ولدیت: _____

مکمل پتا: _____

فون نمبر: _____

کوپن برائے

قرآن کوئز ۳

نام: _____ ولدیت: _____

مکمل پتا: _____

فون نمبر: _____

مقابلۂ خوش خطی ۲

نام: _____ ولدیت: _____

مکمل پتا: _____

فون نمبر: _____

کوپن برائے

تین کا اچار

نام: _____ ولدیت: _____

مکمل پتا: _____

فون نمبر: _____

ہدایات: جوابات ۳۱ اکتوبر ۲۰۲۰ء تک ہمیں موصول ہو جانے چاہییں.....☆ایک کوپن ایک ہی ساتھی کی طرف سے قبول کیا جائے گا.....

☆کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والے جوابات قرعہ اندازی میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔

پیارے بچوں کے لیے
پیاری کتابیں
سچی دوستی
جنت کا دروازہ
چہکتی چڑیا
مسکراہٹ نگر
نئی کہانی نیا انداز
آؤ دوڑ لگائیں
صرف ایک عمل
سنت کہانی
مکتبہ بیت العلم
فدا منزل، نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی۔
+92-312-3647578 ، +92-21-32726509
17 الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
+92-321-4361131 ، +92-42-37112356
ای میل:mbikhi.pk@gmail.com، ویب سائٹ:www.mbi.com.pk

سلسلۂ

تحفۃ الدعاء

دعا عظیم نعمت اور انمول تحفہ ہے، دعا اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس سے راز و نیاز کا ذریعہ ہے، دعا مایوسی میں امید کی کرن ہے، دعا کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام مسائل حل کروا سکتے ہیں، اس دنیا میں کوئی بھی انسان کسی بھی حال میں دعا سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

اسی فکر کے پیشِ نظر "مکتبہ بیت العلم" نے تحفۃ الدعا سیریز کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! اس سیریز کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں۔

MaktabaBaitulilm

بیت العلم

Karachi Ph : 021-32726509
Lahore Ph : 042-37112356
www.mbi.com.pk